

جہانِ غالب

24



جہانِ غالب

یادگار حکیم عبدالحمیدؒ

جلد: 12 شماره: 24

نگراں

پروفیسر شمیم خفئی

ایڈیٹر

ڈاکٹر عقیل احمد

غالب اکیڈمی، بستی حضرت نظام الدین، نئی دہلی

جہانِ غالب

یادگار حکیم عبدالحمیدؒ

جلد: 12

شمارہ: 24

جون 2017 تا نومبر 2017ء

قیمت فی شمارہ: -/20 روپے

قیمت سالانہ: -/40 روپے

ڈاک سے: -/50 روپے

کیوزنگ: بشری بیگم

طابع و ناشر

ڈاکٹر عقیل احمد

سکریٹری: غالب اکیڈمی

بہتی حضرت نظام الدین، نئی دہلی۔ 110013

فون نمبر: 9868221198, 24351098

ای میل: ghalibacademy@rediffmail.com

ویب سائٹ: www.ghalibacademy.org

ISSN -2349-0225

پتھر و پاشر ڈاکٹر عقیل احمد نے غالب اکیڈمی کی طرف سے شریانی آرٹ پریس 1480 گلشن حکیم محل، غالب، علیہ داران،
دہلی سے چھپوا کر غالب اکیڈمی 168/1 بہتی حضرت نظام الدین، نئی دہلی 13 سے شائع کیا۔ ایڈیٹر: عقیل احمد

فہرست

5	ایلیٹر	اس شمارے میں
7	پروفیسر شریف حسین قاسمی	غالب کی ایک نزل کے بارے میں
12	پروفیسر قاضی جمال حسین	مشکوٰۃ چراغِ دہر
21	پروفیسر قاضی افضال حسین	کلام غالب کی کثرتِ تخریج کے اسباب
31	جواد یحییٰ رحمانی	غالب تنقیدِ آل احمد سرور
36	دیپک بدی	جو گندہ پال کی تخلیقی کائنات
46	ڈاکٹر حنا آفرین	تنویر احمد علوی کی غالب شناسی
61	ڈاکٹر شفیق الیوب	غالب شناس: کمال احمد صدیقی
68	ڈاکٹر محی اقبال	غالب کی شاعری کا صوفیانہ مزاج
79	پروفیسر شافع قدوائی	اردو صحافت کے علمی و تحقیقی تناظر کا مستند حوالہ: گرچہ چند دن
86	نریش مدیم	ہندوستانی صحافت کا ارتقاء: 1947ء سے پہلے
97		سکھوں کی ہاتھی
105		ادبی سرگرمیاں



اس شمارے میں

جہان غالب کا چوبیسواں شمارہ پیش خدمت ہے۔ جہان غالب کے شماروں میں عام طور سے غالب اکیڈمی کے سیمیناروں میں پڑھے گئے مقالے ہی شامل کئے جاتے ہیں۔ اس بار فردوسی میں جو سیمینار ہوا تھا اس میں غالب اکیڈمی سے تعلق رکھنے والے اور کچھ غالب پر کام کرنے والے بزرگوں پر (جواب اس دنیا میں نہیں رہے) پر پڑھے گئے۔ کچھ پر پڑھے خصوصی طور پر غالب پر ہی لکھے گئے اس لیے اس پر پڑھے میں غالب کے ساتھ ساتھ غالب کی دنیا بھی سمٹ آئی ہے۔

پہلا پرچہ پروفیسر شریف حسین قاضی کا غالب کی ایک غزل کے بارے میں ہے خاص طور سے غزل میں پیش کوئی تلمیحات سے غالب کی انفرادیت کو واضح کیا ہے۔

دوسرا پرچہ پروفیسر قاضی جمال حسین کا مثنوی چراغ دیر ہے۔ غالب کی فارسی مثنوی چراغ دیر بہت مشہور و مقبول ہے آج کل اس کی اہمیت میں اضافہ بھی ہو گیا ہے کہ پوری مثنوی بنارس کی منظر کشی کرتی ہے۔ اس مقالے میں مثنوی پر سیر حاصل گفتگو کرتے ہوئے غالب کے شعری محاکات کو اجاگر کیا گیا ہے۔ غالب کی تخیل کی جولا نیاں تشبیہات اور پیکر تراشی پر خاص توجہ دی گئی۔ فارسی سے ناواقف لوگ بھی مضمون پڑھ کر مثنوی سے پوری طرح واقف ہو سکتے ہیں۔

تیسرا مضمون پروفیسر قاضی افضل حسین کا مضمون کلام غالب کی کثرت تخریج کے اسباب ہے۔ اس مضمون میں غالب کے کلام پر نگہی جانے والی شرحوں کے حوالے سے بات کی گئی ہے۔ کثرت تخریج کا پہلا سبب یہ سمجھ میں آتا ہے کہ شارح کو پہلے کی شرحوں پر اطمینان نہیں تھا۔ دوسری

وجہ غالب کا پسندیدہ طرز اظہار ہے۔ مقالہ نگار نے مختلف شرحوں پر گفتگو کرتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اتنی شرحیں لکھنے کے بعد بھی غالب کے کلام میں اور بھی کچھ ہے جو ابھی ابھی تجزیے کی گرفت میں نہیں آسکا۔

چوتھا مضمون جاوید رحمانی کا غالب تنقید اور آل احمد سرور ہے جس میں سرور صاحب کی تنقیدی رویہ پر خاص توجہ دی گئی ہے۔

مشہور افسانہ نگار جو گندہ پال صاحب ایک عرصے تک غالب اکیڈمی کی گورننگ کونسل کے رکن کی حیثیت سے وابستہ تھے۔ سیمینار میں جناب ڈاکٹر دچک بدکی صاحب نے جو گندہ پال کی تخلیقی کائنات کے عنوان سے مقالہ پڑھا تھا۔ وہ مقالہ شامل اشاعت ہے۔ ماہر غالبیات ڈاکٹر تحویر احمد علوی کی کتابوں کے حوالے سے ڈاکٹر حنا آفرین نے اپنا مقالہ سیمینار میں پڑھا تھا، وہ بخش خدمت ہے۔ کمال احمد صدیقی پر ڈاکٹر شفیع ایوب نے پرچہ پڑھا تھا وہ بھی بخش خدمت ہے۔ ڈاکٹر می اقبال نے میل کے ذریعے غالب کی شاعری کا صوفیانہ مزاج کے عنوان سے مقالہ بھیجا ہے۔ وہ بھی یہاں شامل اشاعت ہے۔ جناب گرہین چندن صاحب اکیڈمی کے قلمسین میں تھے۔ ان پر ایک سیمینار اردو صحافت کا سفر اور جی ڈی چندن کی صحافتی خدمات کے عنوان سے کیا گیا تھا۔ جناب نریش غم صاحب اور جناب پروفیسر شافع قدوائی صاحب کا مضمون بھی اس شمارے میں شامل ہے۔ کتابوں کی باتیں میں اس بار عوام الناس کے صدر یعنی اسے پی جے ایو لکھام مرحوم پر جناب ایس ایم خان کی انگریزی کتاب (جو جلد ہی اردو میں شائع ہونے والی ہے) پر تبصرہ کیا گیا۔ مبصر سید وجاہت مظہر نے بڑی تفصیل کے ساتھ انگریزی کتاب کا اردو میں تبصرہ کیا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ مبصر کو اردو اور انگریزی زبان سے پوری واقفیت ہے۔

اکیڈمی کی سرگرمیوں سے یہ اندازہ ضرور ہوگا کہ غالب اکیڈمی اپنے پروگراموں میں مسلسل اضافہ کر رہی ہے۔ امید ہے یہ شمارہ آپ کو پسند آئے گا۔



پروفیسر شریف حسین قاسمی

غالب کی ایک غزل کے بارے میں

غالب کی ایک غزل کی روشنی میں کلام غالب کی معنویت پر گفتگو غزل یہ ہے

دہر میں نقش ونا وجہ تسلی نہ ہوا ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندہ معنی نہ ہوا
ہبڑا خط سے ترا کاگل سرکش نہ دبا یہ زمرہ بھی، حرب دم افق نہ ہوا
میں نے چاہا تھا کہ اندوہ ونا سے چھوٹوں وہ تنگ مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا
دل گزر گاہ خیال سے و ساغر ہی سی گر نفس چادہ سر منزل تقویٰ نہ ہوا
ہوں ترے وعدہ نہ کرنے میں بھی راضی کہ کبھی گوش منت کش گلابک تسلی نہ ہوا
کس سے محرومی قسمت کی شکایت کیجیے ہم نے چاہا تھا کہ مرجائیں، سو وہ بھی نہ ہوا

مر گیا صدہ یک جنبش لب سے غالب

نا توانی سے حریف دم عیسیٰ نہ ہوا

سات اشعار پر مشتمل یہ ایک رواں غزل ہے۔ کلام میں روانی اس حقیقت کی ترجمان ہے کہ وہ دل سے نکلا ہے آہ ہے آہ و نیش۔ اس پوری غزل میں یہی فضا چھائی ہوئی ہے۔

دنیا میں ونا یعنی عہد و پیمان کا پورا کرنا، قول و قرار کا بجالانا، نباہنا، حق دوستی ادا کرنا یہ ایسے اخلاقی محاسن ہیں جن کا فقدان ہے۔ غالب کے معنوی استاد میرزا عبد القادر بیدل نے اس کی وجہ اپنے دل سے پہچنی تھی جس نے جواب دیا۔

بدل گفتم کدائین شیوہ دشوار است در دنیا

نقش در خون تہہ و گت پاس آشنائی حا

دل سے پوچھا: زندگی میں کون سا کام مشکل ہے، روح کا نپ اٹھی، خون کے آنسو روئی اور

جواب دیا: آشنائی کا پاس رکھنا حق دوستی ادا کرنا،

اس غزل میں غالب نے بڑی تعداد میں خوبصورت نئی تراکیب وضع کی ہیں اور اگر بعض کہیں سے مستعار بھی لی ہیں تو ان کے حسن انتخاب کی داد دینی چاہیے۔ اس غزل میں یہ تراکیب ملاحظہ فرمائیے: نقش وفاق، کاکل سرکش، حریف دم افغی، اندوہ وفاق، گزرگاہ خیال، چادر سر منزل تقویٰ، کجباکب تسلی، حریف دم عیسیٰ وغیرہ۔ ان تراکیب نے اسی موضوع، وفاق کا فقدان اور دنیا سے دوست پر دیگر شعرا کے کلام سے غالب کے کلام کو ممتاز کر دیا ہے اور غالب اگر کسی خیال کی تکرار بھی کرتے ہیں تو ان کے کلام میں الفاظ و بیان کی ندرت اس خیال کی فرسودگی کا احساس نہیں ہونے دیتی۔

صاحبان ذوق بخوبی واقف ہیں کہ یہ ایک پیش پا افتادہ موضوع ہے۔ شاید ہی کوئی شاعر ہو جس نے دنیا میں بے وفائی کی شکایت نہ کی ہو۔ یہ بے وفائی مجوزۂ دہر کی بھی ہے اور حسینان جہاں کی بھی، مزید برآں سپہرینگوں سے مصیبتوں کی پییم بارش الگ، ان سب نے مل کر ہمارے شعرا کو نہ دین کا چھوڑا نہ دنیا کا۔ غالب بھی ان میں شامل ہیں۔

غالب کے فکر و اسلوب پر تفصیل سے لکھا گیا ہے۔ کوئی ایسا شعر جس میں غالب کے فکر و نظری ندرت کا فرما ہے، ناقدین غالب کا نظر انتخاب سے شاید بچ نہیں سکا۔ اس ضمن میں ناقدین نے بڑی دقت نظر کا ثبوت دیا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ سات اشعار پر مشتمل اس غزل کا ایک شعر بھی ناقدین کی نظر میں قابل انتخاب نہیں ٹھہرا۔

اس غزل میں دو اشعار میں دو مختلف تمبیحات استعمال کی گئی ہیں۔ راقم ان ہی دو اشعار پر مہنگو کرنا چاہتا ہے۔ یہ عرض کروں کہ غالب کے اردو کلام میں تمبیحات پر محدود نیازی صاحب کی ایک کتاب تمبیحات غالب، غالب اکیڈمی نے 1972 میں شائع کی تھی۔ اس موضوع پر دو ایک مضمون بھی میری نظر سے گزرے ہیں۔ غالب کے فارسی کلام میں تمبیحات پر دو ایک مضامین کے سوا کوئی کام انہماں نہیں دیا گیا۔ یہ بہر حال ایک فعل اور نسبتاً مشکل کام ہے۔ فارسی کلام میں غالب نے کثرت سے تمبیحات استعمال کی ہیں۔ قبل اسلام اور اسلامی ایران کی سیاسی اور ثقافتی تاریخ، عمومی اسلامی تاریخ و تہذیب، ہندوستانی سماجی تاریخ و سائیر سے ماخوذ محض افسانوی روایات جو کسی ہندوستانی فارسی شاعر کے کلام کا حصہ نہیں بن سکیں۔

معاصر تاریخ و سماج وغیرہ یہ سرخوشے ہیں غالب کی تلمیحات کے۔ ان تلمیحات سے غالب نے اپنی شاعری کو خوشی، رحمتی اور حسن کی دولت عطا کی ہے اور اپنی فطری ظرافت، جدت پسندی و ذکاوت سے نئے نئے معنی، اشارے اور نئے آفاق پیدا کیے ہیں۔ مشہور تلمیحات کو نئے نئے انداز سے برتا ہے اور کلام میں حسن اور زور پیدا کیا ہے۔ معنی و مطالب کے دریا کو کوزہ میں بند کیا ہے بڑی ہنرمندی سے۔ اس فنرل کا یہ شعر ملاحظہ کیجیے۔

ہنرہ خط سے ترا کا کل سر کشی نہ دیا

یہ زمرہ بھی حریف دم افغانی نہ ہوا

مشہور ہے کہ زمرہ کے سامنے سانپ اندھا ہو جاتا ہے۔ مگر تیرا ہنرہ خط جو قیمتی پتھر زمرہ کی طرح ہنرہ ہے، اس پر افغانی زلف کا کوئی اثر نہ ہوا یعنی خط نقل آنے کے بعد بھی ان زلفوں کی جو کھیتی سے چہرہ پر گرالی جاتی ہیں، دل فریبی میں فرق نہیں آیا۔ یہاں ایک امر کی طرف توجہ دلائی دلچسپی سے خالی نہ ہوگی۔ زمرہ پر نگاہ پڑنے سے افغانی کا اندھا ہو جانا، ایک خاصا قدیمی شاعرانہ تصور ہے۔ غالب نے بھی اسی بنیاد پر یہ شعر کہا ہے۔ یہ تلخی قاری میں کثیر الاستعمال نہیں، لیکن قدیم شعرا نے اس پر توجہ دی۔ خاقانی اور حافظ کے کلام میں یہ تلخی نظر آتی ہے۔ غالب نے ان دونوں ایرانی شعرا کا احترام سے ذکر کیا ہے۔ بعید از قیاس نہیں کہ ان کے ہی کلام سے غالب اس تلخی سے واقف ہوئے ہوں۔ بعض تافہ سے بچا چلتا ہے کہ اس گمان کی تصدیق کے لیے افغانی کے سامنے زمرہ رکھا گیا، لیکن وہ اندھا نہیں ہوا۔ اس پہلے تجربے کے بارے میں یہ خیال ہوا کہ ممکن ہے زمرہ اچھا نہ رہا ہو۔ اس لیے افغانی اندھا نہیں ہوا۔ بہتر ذہنیت، و کیفیت کا زمرہ پھر حاصل کیا گیا اور یہ تجربہ پھر دہرایا گیا۔ نتیجہ وہی رہا کہ افغانی کی آنکھیں صحیح سلامت رہیں۔ غالب نے اپنے ایک اردو خط میں لکھا ہے:

”قبول دعا وقت خلوع، مجملہ مضامین شعری ہے، جیسے کہ ان کا پر تو ماہ میں پست جانا اور زمرہ سے افغانی کا اندھا ہو جانا۔ آصف الدیوان نے افغانی تلاش کر کے منگوا لیا اور قطعات زمرہ اس کے محاذی چشم رکھے، کچھا اثر نہ ہوا۔ ایمان دردم سے انواع کپڑے منگوائے۔ چاندنی میں پھیلائے کوئی مسکا بھی نہیں۔“

یعنی غالب یہ جانتے تھے کہ زمرہ سے افغانی کا اندھا ہونا، محض شاعرانہ خیال ہے۔ اس کی کوئی

حقیقت نہیں، اس لیے انھوں نے ایرانی شعرا کے روایتی تصور کو نظر انداز کر دیا اور کہا کہ میرے محبوب کے، انھی کے مانند سرکش کا کل زمرہ جیسے ہنرء خط سے کسی طرح متاثر نہیں ہوئے۔ یہی ہونا بھی چاہئے تھا اور اس طرح اس روایتی تصور کی تکذیب کر دی کہ زمرہ دیکھ کر انھی اندھا ہو جاتا ہے۔ غالب نے یہ تصحیح صرف اپنے اردو کلام میں استعمال کی ہے، فارسی کلام میں نہیں، ایسی متعدد تلمیحات ہیں جو غالب نے صرف اردو کلام میں نظم کی ہیں، فارسی میں نہیں اور اس کے برعکس بھی ہے۔ محمود نیازی صاحب کی کتاب تلمیحات غالب میں یہ تصحیح شامل نہیں۔

حضرت عیسیٰ مسیح سے متعلق غالب نے اپنے کوئی پانچ اردو اشعار میں اشارے کیے ہیں:

ابن مریم ہوا کرے کوئی میرے دکھ کی دوا کرے کوئی
لب عیسیٰ کی جنبش کرتی ہے گہوارہ جویانی قیامت، کشتہ طعل تباں کا خواب نکلیں ہے
رنجِ عظیم سمجھا نہیں اٹھتا مجھ سے دور ہوتا ہے مرے دل میں جو تڑپوں ہالیں
اور ایلین برون کی مدح میں قصیدے کا ایک شعر ہے

وہ محض رحمت و رافت کہ بہرائل جہاں نیابت دم عیسیٰ کرے ہے جس کی نگاہ
اور ایک شعر اسی غزل کی

مر گیا صدمہ یک جنبش لب سے غالب ناتوانی سے حریف دم عیسیٰ نہ ہوا
طباطبائی نے اس کا یہ ترجمہ کیا ہے:

اس شعر میں معنی کی نزاکت یہ ہے کہ شاعر حرکت لب عیسیٰ کو صدمائے عیسیٰ کی حرکت سے مقدم سمجھتا ہے۔ کہتا ہے کہ میں پہلی حرکت لب ہی کے لئے تہن (تہنرپ) سے مر گیا اور حریف دم عیسیٰ نہ ہوا۔ یعنی دم عیسیٰ سے معاملہ نہ پڑا اور ناتوانی کے سبب سے صدمائے عیسیٰ کے سننے کی نوبت ہی نہ آنے پائی۔

بظاہر تو یہی معنی و مفہوم ہے اس شعر کا، لیکن اس کا ایک نکل اور بھی ہو سکتا ہے جو دلچسپ ہے اور غالب کی ندرت پسند اور شوخ طبیعت سے زیادہ قریب بھی ہے۔ مثلاً

غالب کی شوخی طبیعت مسلم ہے۔ ان کے متعدد اشعار کو ان کے میلان طبع نے بھی انفرادی اور امتیازی شان بخشی ہے۔ عرض کر چکا ہوں کہ یہ غزل بنیادی طور پر وفا کے فقدان یعنی جو روجھا کے

عام ہونے کی شکایت کے اظہار کے لیے کبھی گئی ہے۔ غالب اس بے وقائی کے شکار ہیں جو انہیں جیتے نہیں دیتی ہے نہ مرے۔ یہ بے وقائی کے مرض نے انہیں بہت کمزور و ناتواں بنا دیا ہے اور وہ آخر کار صاحب فراموش ہو گئے، ناتوانی سے مرنے کے قریب ہیں۔ غالب کا گمان ہے کہ بھیسی مسک ان کے درد کا مداوا نہیں کر سکتے۔

ابن مریم ہوا کرے کوئی میرے دکھ کیا دوا کرے کوئی
اسی لیے انہوں نے اب بھی اپنی بیماری کے ازالے کے لیے حضرت مسک سے مدد نہیں مانگی،
لیکن ان کی حالت ڈار کی خبر اڑتی حضرت مسک تک پہنچ گئی، غالب کے عالی مقام کے پیش نظر
حضرت عیسیٰ دوڑے ہوئے ان کی عیادت کو آئے۔ حضرت عیسیٰ کا معجزہ تھا کہ ان کے دم و درود
سے بیمار کو شفا ہو گئی تھی اور مردے زندہ ہو جاتے تھے۔ غالب یہ سب کچھ جانتے تھے لیکن پاس نفس
کی وجہ سے وہ کیوں کسی سے مدد لیں اور احسان اٹھائیں وہ چاہے حضرت عیسیٰ ہی کیوں نہ ہوں۔
حضرت عیسیٰ ناتواں غالب کے قریب پہنچے۔ وہ چاہتے تھے کہ غالب کی صحت یابی کے لیے دعا
پڑھیں۔ زبان سے لفظ یا جملہ نکلنے سے پہلے ہونٹوں کو جھنکھتی ہوئی ہے۔ دعا کے زبان پر آنے سے
پہلے حضرت عیسیٰ مسک کے ہونٹ ہلے۔ غالب سب سے ناامید ہو چکے تھے۔ اس سلسلے میں ان کی
نگاہ میں سب متھوک تھے۔ انہوں نے جو حضرت مسک کے ہونٹ ہلتے دیکھے، سمجھے کہ یہ بھی میری
صحت کی دعا تو کرنے سے رہے، کہیں بد دعا نہ کریں، دہل گئے اور ایسے کہ مر گئے اور مر کیا گئے،
اندوہ و فقاہ سے نجات حاصل کر لی۔

رنجِ تقسیم مسیحا نہیں اٹھتا مجھ سے درد ہوتا ہے مرے دل میں جو توڑوں پالیں
اس شعر کی روشنی میں یہ مفہوم بھی نکالا جاسکتا ہے کہ غالب بیمار و ناتواں بستر پر ہیں۔ عیسیٰ مسک
آگئے، غالب ان کی تقسیم کیا احسان کا بوجھ اٹھانا نہیں چاہتے، اس لیے ان کے دعا کرنے سے
پہلے ہی چل بے اور حضرت عیسیٰ کے ہمارا احسان کے نیچے دبنے سے بچا گئے۔



قاضی جمال حسین

مثنوی چراغ دیر

کلکتے کا سفر اور اس سفر میں پیش آنے والے تجربات، غالب کے سوانحی کوائف میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس سفر کی ایک اہم یادگار مثنوی چراغ دیر ہے جو قیام بنارس کے دوران لکھی گئی۔ غالب جون 1827 کے اواخر یا جولائی کے شروع میں باغیچہ کے لیے روانہ ہوئے وہاں ایک دن کا قیام کے بعد بذریعہ کشتی الہ آباد پہنچے۔ الہ آباد میں بھی وہ ایک ہی دن رکے۔ الہ آباد سے بنارس آئے اور بنارس میں انھوں نے چار ہفتہ قیام کیا اور یہیں اپنی مشہور مثنوی چراغ دیر لکھی۔ باغیچہ سے چل کر بنارس پہنچنے تک کی تفصیلات غالب نے اپنے فارسی خط نام مولوی محمد علی خاں سولجیج میں لکھی ہیں یہ خط سید اکبر علی ترمذی کی مرثیہ کردہ ”نامہ ہائے فارسی غالب“ میں شامل ہے۔ یہ خط سفر کی تفصیلات کے ساتھ ہی ان کی ذہنی کیفیات کا بھی دلچسپ مرقع ہے۔ اس خط کے بعض بیانات بہت دلچسپ ہیں۔ غالب نے الہ آباد میں بس ایک روز ہی قیام کیا۔ اس ایک دن میں غالب نے الہ آباد کے متعلق کیا رائے قائم کی؟ ملاحظہ کیجیے:

”افسوس الہ آباد پر۔ اس ویرانے پر خدا کی لعنت۔ وہاں نہ تو بیمار کے لیے کوئی دوا ملتی ہے نہ مہذب انسانوں کی ضرورت کا کوئی سامان دستیاب ہے اس ہولناک دلدلی کو شہر کہنا سراسر ناانصافی ہے۔ اس بھوتوں کی بستی میں رہنا کیسی بے حیائی ہے۔ خدا کی قسم کلکتہ سے واپسی پر اگر الہ آباد کے راستے سے جانا پڑا تو وطن ترک کر دوں گا لیکن اس راستے سے ہرگز واپس نہیں جاؤں گا۔“

لیکن بنارس پہنچنے ہی اس شہر کے موسم، یہاں کی فضا اور آب و ہوا سے غالب اتنے سرشار ہوتے ہیں حیرت ہوتی ہے۔ یہاں ایک مہینہ ٹھہرتے ہیں اور اس شہر کی تعریف میں مشہور مثنوی

”چراغ دیر“ لکھتے ہیں۔ بنارس کی مبالغہ آمیز تعریف اور ایک مینے کی طویل قیام کے پیش نظر حاضی عبدالودود نے لکھا ہے کہ:-

”میرا خیال ہے کہ بنارس میں کسی صورت سے تعلق ہو گیا تھا۔ طویل اقامت کی اس کے علاوہ کوئی وجہ قرین قیاس نہیں۔ وہ جیسا کہ خود معترف ہیں کہ بڑی جھنڈی سی جگہ مقیم تھے۔ مگر اس کے باوجود بنارس کی مدح اتنی کی کہ کسی اور جگہ کی نہیں کی۔ بنارس اس کا ہرگز مستحق نہیں“ (بحوالہ ضیق انجم ص 62 غالب کا سفر نکلتے اور نکلتے کے ادبی سفر کے)

اپنے فارسی خطہ تمام محمد علی خاں میں غالب اپنی قیام گاہ کے بارے میں لکھتے ہیں:-

”پانچ دن سرائے نیرنگ آباد میں جو سرائے نورنگ آباد کے نام سے مشہور ہے ضائع ہو گئے اس کے بعد اسی محلہ میں اسی سرائے کے پیچھے ایک مکان مل گیا چنانچہ اس میں مکان جو بیکس کی قبر بن گیا اور تنگ دتار یک ہے میں نے رشتہ سفر سکھ لیا ہے اور افتادگی کے بہتر پر پڑا ہوا ہوں“ (ص 177 اور ترجمہ نامہ ہائے فارسی غالب از پرتو وہیلہ)

لیکن اس تنگ دتار یک گھر میں قیام کے باوجود غالب نہ تو کبیدہ خاطر ہوتے ہیں نہ دل برداشتہ بلکہ اپنے اسی خطہ میں وہ بنارس کی شان میں نثری قصیدہ لکھتے ہیں۔ اس شعر کے نواح میں قدم رکھتے ہیں انھیں ”باد جاں فزا اور نسیم روح آسا“ چلتی ہوئی محسوس ہونے لگتی ہے۔ روح پرور ہوا کی مستی نے غالب کی تمام بیماری اور جسمانی کمزوری دور کر دی۔ محمد علی خاں کے نام اپنے ایک خط میں غالب بہت دور تنگ اسی دارقٹی سے بنارس کی تعریف میں رطب اللسان نظر آتے ہیں۔ حیرت ہوتی ہے کہ ہمیدہ بھر کے طویل قیام میں انھیں بنارس کے کسی شخص سے کوئی شکایت نہیں ہوئی بلکہ وہ اس بات کی حسرت کرتے ہیں کہ کاش یہاں سے سفر کرنے کی مجبوری نہ ہوتی تو میں بنارس کا ہی ہو رہتا اور اسی سرزمین میں خود کو پیوند خاک کر دیتا۔ غالب

کے الفاظ ہیں:-

”کیلیجٹ نگارہ امیں چاہی، دل رافر و گرفت کہ دلی را جز بر طاق نیایا چاند نامہ“

اگر لوگوں کی طاقت کا اندیشہ نہ ہوتا تو

”بے مہا ترک دیں کر دی و سہجہ کستھی و کشہ فرو کشیدی، و ز نار فر و ہستی۔

تاہم دی وضع چنداں بر کنار گنگ شستی کہ گرد آ لاف ہستی از خود فرو شستی و چوں

قطرہ بہ دریا ہستی (23-24 نامہ ہائے فارسی غالب مرتبہ سید اکبر علی ترمذی)

بنارس سے غالب کے اس غیر معمولی شغف اور طول انامت سے متعلق قاضی عبدالودود کا

بیان اوپر گزر چکا ہے۔ قاضی صاحب نے قرآن کی بنیاد پر یہ قیاس بھی کر لیا کہ انہیں بنارس

میں کسی خاتون سے عشق ہو گیا تھا اس لئے تنگ و تنار یک مکان میں گم نامی کی زندگی گزارنے

کے باوجود انہوں نے بنارس میں چار ہفتہ قیام کیا جبکہ کلکتہ کی منزل ابھی بہت دور ہے اور طویل

سفر درپیش ہے۔ مالک رام صاحب کا بھی یہی خیال ہے کہ چراغ دیر سے اشعار میں جس

والہانہ انداز میں وہ شہر بنارس اور حسنان بنارس کا ذکر کرتے ہیں اس سے اس خیال کو تقویت ملتی

ہے کہ بنارس میں غالب کسی کو دل دے بیٹھے تھے۔ گل رعنا کے مقدمہ میں مالک رام لکھتے ہیں:

”مجھے یقین ہے کہ اس مثنوی میں بہت سے شعر آپ بیتی سے متعلق ہیں

اور اس میں انہوں نے اپنے واردات قلب بیان کئے ہیں۔ اس عارت گروہ کو

یہاں سے چلے جانے کے بعد بھی وہ بھلا نہیں سکے اور اسے یاد کرتے رہتے

ہیں (ص 37 گل رعنا مرتبہ مالک رام)

مالک رام صاحب اپنے اس خیال کی تائید میں غالب کی فارسی غزل کا یہ مطلع بھی پیش

کرتے ہیں۔

کاش کاش بہت کاشی در پند یروم غالب

بندہ تو ام گوئم، گویدم ز باز آ رہے

اپنے ایک دوسرے مضمون "غالب فارسی تصانیف مشمولہ گفتار غالب میں اس بت کاشی کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"یہ بت کاشی وہی غارت گر ہوش ہے جس نے ان سے چراغ دیر کی ہی بے مٹائی مثنوی کہلاوائی۔" (ص 188 گفتار غالب از مالک رام)

لیکن اس طرح کے بیانات کو محض قیاس ہی کہا جاسکتا ہے کیونکہ کسی خارجی شہادت سے اس عشق کا ثبوت نہیں ملتا کہ غالب کسی بت کاشی کو دل دے بیٹھے تھے۔

یہاں اس میں کسی غارت گر ہوش کو دل دے بیٹھے اور اس سلسلہ میں کوئی قطعی رائے قائم کرنے سے پہلے یہ باتیں بھی پیش نظر رکھنا چاہیے کہ:-

1۔ پوری زندگی میں کوئی ایسا واقعہ تاریخی ثبوت کے ساتھ نہیں ملتا جس سے غالب کے کسی معشوق کا پتہ چلتا ہو۔ غالب کی ستم پیشہ و مثنیٰ بھی ابھی دریافت طلب ہے بھروسہ ایسے ہوشیار اور ذریعہ ہیں کہ ان معاملات میں کوئی ایسا نشان چھوڑتے بھی نہیں کہ اصل حقیقت تک رسائی ممکن ہو۔

2۔ غالب تو دوستوں کو بھی مصری کی کہی بننے کی نصیحت کرتے ہیں چہ جائیکہ خود ہی شہد میں پھنس کر اپنی آزادہ روی سے دست بردار ہو جائیں۔ جس کے ملک میں چنا جان اور منا جان میں کوئی فرق ہی نہ ہو اس کے عشق و عاشقی کی حقیقت معلوم۔ وہ کسی ایک کا ہو کر بھلا کیسے اور کب تک رہ سکتا ہے۔

3۔ اور سب سے اہم بات یہ ہے یہ شاعر کا ایک انداز بیان اور ہیرو ایہ اظہار ہے کہ "بت کاشی" کے حوالے سے باطنی کیفیات کے بیان کا وہ ایک اوتھما پہلو پیدا کرتا ہے۔ یہ معنی آفرینی کا ایک انداز ہے۔ شاعر اپنی زندگی کے واقعات نہیں بیان کرتا بلکہ انوکھے اسلوب میں اپنی فنکاری کا مظاہرہ کرتا ہے۔ چنانچہ خواجہ حافظ "بت کاشی" کی جگہ "ترک شیرازی" کا ذکر کرتے ہیں جس کے رخصت پر سیاہ جل کے عوض وہ سر نقد و بھارا جیسے بارہائی شہروں کو بھی قربان

کرنے کو تیار ہیں۔

اگر آں ترک شیرازی ، بہ دست آرد دل مارا
بہ خال موہندوش عظیم سمر قد و بخارا

(خولجہ حافظ)

اُس لیے نہ تو غالب کے بہت کاشی کو تلاش کرنے کی ضرورت ہے نہ ہی خولجہ حافظ کے ترک شیرازی کو۔ یہ محض ایک شاعرانہ انداز بیان ہے۔

محمد علی خاں کے نام اسی تاریخی خط میں ایک جگہ غالب لکھتے ہیں:

قبلہ بگاہ! بہ خاطر اقدس نہ گزرد کہ غالب از خیرہ سری و پریشان نظری در
بنارس ہمہ چو کس مسل درود و دل فرد ماندہ باشد حاشا حاشا چوں من فلک
دور اسرود برگ اقامت کھا و دل و دماغ تماشا کو۔ مگر ضرورت گرد آوردن بعضے و
دادہ پاک حاجت بدائیں اکثر است و فراہم کردن پارہ از رشت سڑک زمستان را
درخواست۔ اتفاق قیام افتاد۔“ (ص 24 نامہ ہائے فارسی غالب)

مجھ جیسے فلک زدہ کے پاس کسی جگہ قیام کے لیے سامان کھا اور تفریح کے لیے دل و دماغ
کہاں یہ قیام مجھے ان دواؤں کی فراہمی کی خاطر کرنا پڑا جو اکثر میرے استعمال میں رہتی ہیں
اور قدرے سامان مہیا کرنے کے لیے جس کی جائزے میں ضرورت تھی۔

غالب کی اس صراحت کے بعد تو شبہ رفع ہو جانا چاہیے وہ کسی بہت کاشی کے دام تدمیر میں
گرفتار ہو گئے تھے اس لیے بنارس شہر روئے زمین پر بہشت کی مانند نظر آنے لگا۔

جہاں دیر نہ تو شاعر کی نجی روادا ہے نہ بنارس کی تاریخی و محتویات۔ یہ محض ایک فنی شاہکار
ہے جسے غالب نے مختلف شاعرانہ تدابیر کی مدد سے تیار کیا ہے۔ اس مثنوی میں غالب کے
تخیل کی جولانیاں دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ تشبیہات کی قدرت، ویکروں کی کثرت اور
غالب کی خیال بندی کے کرشمے اس مثنوی کا امتیازات ہیں اور انھیں شاعرانہ خوبیوں کی وجہ

سے یہ فارسی شعر و ادب کی تاریخ میں ہمیشہ یاد رکھی جائے گی۔

مشقوی کا خاکہ درج ذیل منصوبہ کے تحت تیار کیا گیا ہے۔ مشقوی کے اجزا کو ایسے سلیقے اور ہنرمندی سے مرتب کیا گیا ہے کہ پوری مشقوی سانچے میں دھنی ہوئی اکائی معلوم ہوتی ہے۔ گریز کے مقامات پر غالب نے بیحد کاری کا وہ ہنر دکھایا ہے کہ مشقوی کا تسلسل مجروح نہیں ہوتا مشقوی اس طرح ایک جز سے دوسرے جز میں ضم ہو جاتی ہے جیسے شاخ سے کوئل پھرتی ہے۔ مشقوی درج ذیل چار حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلا حصہ تمہیدی اشعار کا ہے جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ نقد سرائی پر آج میں مجبور ہوں اور میری نالہ و زاری بے سبب نہیں ہے۔ دوسرے حصہ میں دہلی سے نکل کر مختلف مقامات پر بھٹکتے پھرنے کے بیان میں ہے۔ اس حصے میں وہ اپنے تین احباب کا خصوصیت سے ذکر کرتے ہیں۔ مولانا فضل حق خیر آبادی، حسام الدین حیدر خاں اور امین الدین احمد خاں۔ مشقوی کے بیسویں (20 ویں) شعر سے بنارس کا ذکر شروع ہوتا ہے۔ یہ مشقوی کا سب سے طویل حصہ ہے اور تقریباً 170 اشعار پر مشتمل ہے۔ چوتھے اور آخری حصہ میں غالب اپنے ہاٹن اور درون کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور علاقائی دنیا سے دامن مجاہد کر آئندہ سفر کے لیے خود کو آمادہ کرتے ہیں اور خود دکھائی کے انداز میں کہتے ہیں۔

مدہ از کف طریق معرفت را سرت مردم بگرداں شش جہت را (88 واں شعر)

اور اس طرح مشقوی صوفیانہ واردات کے اس بیان پر ختم ہوتی ہے کہ

ز ان دم زن و تسلیم لا شو بگو اللہ و برق ماسوائے شو (108 واں شعر)

غالب کا اصل ہنر اور مشقوی کا حقیقی جوہر شہر بنارس اور مہوشان بنارس کی تصویر کشی میں نکلتا ہے وہ وصف نظری میں نیا نیا اسلوب اختیار کرتے ہیں پھر بھی محسوس ہوتا ہے وہ اپنے بیان سے آسودہ نہیں۔ ابھی انہیں بہت کچھ کہنا ہے۔ "تا کہ تان کا شئی" کے قد و گیسو اور لب و رخسار کی کیفیت کا حق ادا ہو سکے۔ جہت جہت چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔ 21 ویں شعر سے بنارس کا وصف شروع ہوتا اور یہ سلسلہ در تک چلا جاتا ہے۔

- خن رانا زش مینو قنشی زنگبا نک ستانٹھائے کاشی (24)
 تعالیٰ اللہ بنارس چشم بدور بہشت خرم و فردوس معمور (25)
 بنارس راکے گفتہ کہ چین ست بنوز از ملک پشیش بر چین ست (26)
 تاج مشرباں چوں لب کشاید بہ کیش خولیش کاشی راستاید (30)
 کہ ہر کس کا بندوں گلشن بمرود دگر پیوند جسمانی نکیر (31)
 چمن سرمایہ امید گردو برون زندہ جاوید گردو (32)
 زبے آسودگی بخش روانہا کہ داغ چشم ی شویذ جانہا (33)

ان اشعار میں 26 واں شعر توفیق کا شاہکار ہے کہ کسی بے خبر نے بنارس کی دلفریبی سے متاثر ہو کر اسے ملک چین کی مانند قرار دیا تھا۔ بس وہ دن اور آج کا دن۔ بنارس کو اپنی تعریف کا یہ انداز سخت ناگوار ہوا اور اس کی پیشانی پر تل پڑ گئے جو آج بھی دریائے گنگا کی شکل میں دیکھا جاسکتا ہے۔ گنگا شہر بنارس کی وہی چین جہیں ہے جو آج تک قائم ہے حسن و تعلیل کا ایسا خوبصورت اور دلکش استعمال خال خال ہی دیکھنے کو ملتا ہے۔ پھر ”چین“ کے لفظ میں ”صنعت نفیس“ کا بے ساختہ استعمال اس پر مستزاد۔ دوسرے مصرعے کے چشمش ہر چینیں ست میں ش واحد غائب کی ضمیر نفیس کو ابھرنے نہیں دیتی لیکن متن پر پس منظر سے اس کی چوٹ پڑتی رہتی ہے۔ تقریباً بیس چھپیس اشعار ہیں بنارس کے علوم و تربیت کا قصیدہ پڑھا گیا ہے اور تشبیہات کی جھڑی لگا دی گئی ہے اور اسلوب بھی ایسا برجستہ اور رواں کہ حیرت ہوتی ہے۔

شہر بنارس کے بعد حسینان بنارس کی جھلک میں غالب کی زبان ملاحظہ ہو۔

- بنالش رامپولی شعلہ طور سراپا نور ایزد چشم بدور (48)
 میانہا نازک و دلہا توانا زنا دانے بہ کار خولیش دانا (49)
 مجسم بیکہ در لب ہا طعیت دہنہار شک لکھائے رنحیت (50)

- اوائے یک گلستاں جلوہ مرشار خراسے صدقیامت فتنہ دربار (51)
 بہ لطف از موج گوہر نرم روتر نیاز از خون عاشق گرم روتر (52)
 ز رنگیں جلوہ با غارت گیر ہوش بہار بہتر و نو روز آغوش (54)
 قیامت قاحتاں مڑگاں ورازاں مڑگاں بر صف دل نیزہ بازاں (58)
 بہ مستی موج را فرمودہ آرام زلفزی آب رخشیدہ اندام (60)
 ز بس عرض قناری کند مہنگ ز موج آغوشا وای کند مہنگ (62)
 ز تاب جلوہ با بختاب گشتہ مہر با در صد فہا آب گشتہ (63)
 مگر کوئی بنارس شامے بہست ز نگلش صبح و شام آئینہ دردست (64)

اشعار کی روانی انھیں وضاحت کے درجہ کمال تک پہنچاتی رہتی ہے۔ الفاظ یکے بعد دیگر

کمال سہولت سے ساچھے نیں ڈھلے ہوئے نکلتے ہیں۔

معنی آفرینی اور پیکر تراشی کے علاوہ الفاظ کا صوتی آہنگ اور لہجہ بھائے خود فردوس گوش ہے۔ حسینان بنارس کی مستی اور انداز خرام دیکھ کر دریا کی موجیں ٹھہر جاتی ہیں۔ بدن ایسا نرم و نازک گویا پانی مجسم ہو گیا ہو۔ سراپا نگاری کے اشعار میں توجہ طلب بات یہ ہے کہ بیشتر اشعار میں پانی کے تلازمات سے کام لیا گیا ہے۔ صدف گہر موج ”آغوش دریا“ مای نکس اور آب وغیرہ۔ انھیں تلازمات کا سیاق و سباق بدل کر غالب نے نئے نئے معانی پیدا کئے ہیں۔ چنانچہ مثنوی کے اس حصے کو پڑھتے ہوئے کہیں کہیں تو صبح کے وقت گھاٹ پر گونگا اٹھان کرتی ہوئی عورتوں کی تصویر ابھرنے لگتی ہے۔ حسینان بنارس کی تصویر ہے جو غالب کے دل پر نقش کر گئی ہے۔ مختلف نئی نئی تہا میر کی مدد سے غالب اسی کیفیت کی باز آفرینی کرتے ہیں اور مختلف اسالیب سے انھیں نئے نئے قالب میں ڈھالتے ہیں۔

مثنوی کے آخری چند اشعار میں دل کو دنیا اور علاقے دنیا سے دل کو فارغ کرنے کی تسلیں

ہے کہ زندگی مسلسل شعر سے مہارت ہے۔ تادم آخر دے فارغ ہاش، ”آلائش دنیا سے دامن
جہاز کر اٹھ کھڑا ہو اور دل کو فارغ کر لے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ماسوائے اللہ سے دل لگانا ہی
باعث کلفت ہے اس لیے

شر د آسا فتا آمادہ برنج

جنھیں دامن و آزادہ برنج

زلف دم زن و تسلیم لاش

بگو اللہ و برق ماسوائے شو

اور اس طرح ایک متصوفانہ تحقیق کے ساتھ مثنوی اختتام کو پہنچتی ہے۔

اس مثنوی میں غالب کی وسیع المشرقی، ان کا صلح کل اور دیگر مذاہب کے لئے احترام کا
جذبہ، سطح پر نمایاں ہے۔ غالب کی فنی زندگی میں کسی بھی مذہبی عصمت اور تنگ نظری کے لیے
کوئی جگہ نہیں تھی۔ وہ تمام مذاہب کا احترام کرتے تھے۔ ترک رسوم کو وہ توحید کی حیثیت اول
قرار دیتے ہیں۔ ان کا منسلک اپنے اپنے مذاہب سے انسان کی وفاداری کا تھا۔ یہی کشادہ
دلی اور رواداری چراغ دیر میں جا بجا نظر آتی ہے۔ مثنوی کے کئی اشعار میں کاشی کی رصفت
شان اور یہاں مرنے والوں کی نجات ابدی کا بیان مذہبی سرشاری کے ساتھ کیا گیا ہے۔

اس مثنوی کو بنارس کی تاریخی دستاویز تو نہیں البتہ وہاں کی معاشرت تہذیب اور کوچہ و
بازار کا دلکش مرقع ضرور دکھا جاسکتا ہے۔ شہروں کی توصیف میں کبھی گلی شاید ہی کوئی مثنوی اتنی
دلکش اور دلآویز ہو جتنی چراغ دیر۔

آخر آخری بات یہ کہ یہ ایک فنی شاہکار Peice of Art ہے۔ جس میں شاعر کا تخیل نقطہ
کمال پر ہے اجزائے مثنوی کی محظّم اور صنعتوں کے فنکارانہ استعمال نے اسے ایک شاہکار بنا دیا
ہے۔ فارسی شعر و ادب کی تاریخ میں اپنے ادبی محاسن کی وجہ سے چراغ دیر ہمیشہ یاد رکھی جائے گی۔



قاضی انضال حسین

کلام غالب کی کثرت تشریح کے اسباب

شعر کا شرح سے رشتہ جدلیاتی ہے یعنی صرف یہ نہیں ہوتا کہ شعر کچھ کہتا ہے اور شارح اسے اگر نمیک سے سمجھ سکتا تو اسی کو مناسب الفاظ میں بیان کر دیتا ہے بلکہ شارح بھی اپنی تربیت، ذوق اور سمجھ کے مطابق شعر کو اپنی طرح چمکتا اور اس کے وہ معنی بیان کرتا ہے، جو اکثر صورتوں میں شعر کے دوسرے قارئین سے کسی نہ کسی حد تک مختلف ہوتے ہیں۔ شعر سے شارح کے اس جدلیات رشتہ کا ہی نتیجہ ہے کہ اب تک شعر غالب کی پچاس سے زیادہ شرحیں شائع ہو چکی ہیں۔ ان میں کچھ شرحیں پورے دیوان کی ہیں اور بعض شرحیں منتخب اشعار کی ہیں۔ پورے دیوان کی شرحوں میں تو مجبوری ہر شعری شرح لکھنے کی ہے مگر جن شارحین نے منتخب اشعار کی شرحیں لکھی ہیں لازماً اس لئے لکھیں کہ وہ باقی کی شروح سے مطمئن نہیں تھے۔ ہمارے زمانے میں شمس الرحمن فاروقی نے منتخب اشعار کی شرح کا جواز پیش کرتے ہوئے صاف کہا ہے کہ ان اشعار کا انتخاب کیا گیا ہے ”جن میں کوئی ایسا نکتہ ہو جو عام شارح سے نظر انداز ہو گیا ہو یا جن کی شرح میں کوئی ایسی بات کہنا ہو ممکن ہو جو چند اول شروح سے ہٹ کر ہو۔“

پروفیسر نیر مسعود کی شرح ”تعبیر غالب“ کا آغاز بھی غالب کے شعری شرح میں دوسروں سے اختلاف کے ساتھ ہی ہوا۔

واقعہ یہ ہے کہ شعری شرح کے صحیح یا غلط ہونے کا انحصار پہلے تو خود شارح کے مطالعہ اور ذوق پر ہے۔ ایک صاحب ذوق پڑھا لکھا اور تربیت یافتہ شارح ہی شعری وہ شرح لکھ سکتا ہے، جو اس کے علاوہ غالب کے دوسرے قاری کو بھی مناسب معلوم ہو۔ اس اعتبار سے غالب کے پچاس سے

زیادہ شارحین میں کسی کے متعلق یہ کہنا ممکن نہیں کہ وہ اپنے مطالعے یا ذوق کے اعتبار سے کسی دوسرے شارح سے کمتر ہو پھر شعری شرح میں اس قدر اختلاف کیونکر ممکن ہوا کہ ہر شارح یہ دعویٰ کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے شعری شرح دوسرے شارحین کے مقابلے میں زیادہ بہتر لکھی ہے۔

اس کا پہلا اور سائنے کا سبب یہ ہے کہ کوئی شارح شعری تفسیر کا کام اس وقت تک شروع نہیں کرتا جب کہ خود اس کا اپنا ایک تصور شعر مستعار بھی ہو سکتا ہے یا وہ اپنے مطالعہ اور ذوق کی بنیاد پر تشکیل بھی دے سکتا ہے۔ اب یہ ضروری نہیں کہ شارح کا تصور شعر خود شاعر کے اپنے تصور شعر سے پوری مطابقت رکھتا ہو۔ اس کی مثال نظم طباطبائی کی شرحیں ہیں جس میں بقول ظفر احمد صدیقی ”لظم نے تقریباً چالیس اشعار میں مرزا سے اختلاف کیا ہے۔“

دوسری بڑی وجہ غالب کا پسندیدہ طرزِ اظہار ہے۔ غالب سبک ہندی اور بطور خاص ہیدل کے طرزِ اظہار پر فریفتہ تھے۔ کچھ تو خود غالب کی طبیعت مشکل پسند واقع ہوئی تھی اور غالب اپنی طبیعت کی اس صفت کے سبب انہیں وہ طرزِ اظہار بھی پسند آیا جس میں تجربہ اور منطق کی اساس پر شعر کا متن تیار کیا جاتا تھا۔ اس استدلالی انداز میں پہلی بڑی دقت تو خود متن کے الفاظ کا باہم ارتباط قائم کرنا تھا۔ گمان چند جہن کی، تفسیر غالب میں تقریباً ہر مصرعہ پر ایسے شعر ہیں جنہیں جہن صاحب متن کے الفاظ کو باہم مربوط کرنے کی کوشش میں جھکا نظر آتے ہیں۔ الفاظ کے باہم ارتباط میں ایک بڑی دقت یہ بھی ہے کہ غالب نے مفرد لفظ کے مختلف معنی میں کسی ایک معنی یا کئی معنوں میں بعض کا انتخاب کیا۔ اب اگر شارح ایک لفظ میں معنی کی وہ جہات یا اس کی کئی جہات پر گرفت نہیں رکھتا تو شعری تخریج وہ لکھ نہیں سکتا نیز مسعود لکھتے ہیں:

”غالب ایک دشتِ ہزار جاوہ ہے جس میں گنگ مقام تک پہنچنے کے لیے گنگ جاوہ

کا انتخاب اصل چیز ہے اور بد قسمتی سے غالب کے سادہ فکر اور ڈلیدہ خیال دونوں

طرح کے شارحین کی تلافی نے ان جاوہ کو صبح کر دیا ہے۔“ (س: 29)

اس دشتِ ہزار جاوہ میں صبح کون سا ہے اور کس طرح طے ہوتا ہے؟ پس یہاں سے شرح

شعر کے متعلق نئے سوالات قائم ہونے لگتے ہیں۔ ان سوالوں کے جواب کسی شارح کے پاس نہیں۔ نیز مسعود کی تعبیر غالب کا آغاز تھی۔

آشفتگی نے نقش ہو چکا کیا درست

ظاہر ہوا کہ داغ کا سرمایہ دود تھا

کی مختلف تحریکات میں صحیح تشریح کے تنازع سے ہوا ہے۔ تقریباً تیس صفحات پر مشتمل شمس الرحمن فاروقی اور دوسرے شارحین سے نیز صاحب کے اختلاف کی اس بحث میں اب بھی یہ طے نہیں ہوا کہ ان میں صحیح ترین تشریح کون سی ہے اور کیا یہ ممکن ہے کہ اتنی تفصیلی گفتگو کے بعد بھی کوئی شارح کوئی ایسا نقطہ پیدا کر سکتا ہے جو اس شعر کی صحیح ترین تشریح ہونے کا دعویٰ کرے۔ خود نیز صاحب نے غالب کے شعر۔

تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ

جب آنکھ کھل گئی نہ زباں تھا نہ سود تھا

کی نہایت تفصیلی بحث شرح لکھنے کے بعد دوسرے شارحین کو اس سے مختلف شرح لکھنے کی دعوت دیتے ہیں۔ اس تشریح کے اختتام پر لکھتے ہیں:

”معاملہ، زباں اور سود کے سے کاروباری الفاظ کا تلامذہ ایک ہر دو ہے، جس

کے پیچھے سے جھانکتے ہوئے یہ سوال مل کر ایک بڑا سوال بناتے ہیں کیا یہ موت کا شعر ہے؟“

میرے نزدیک اس سوال کا جواب اثبات میں ہے ”صدائے عام ہے یا زبان

نکتہ داں کے لیے۔“

غالب کی سبک اعتبار کا ایک نمایاں طریقہ الفاظ کو غیر روایتی مقامات میں لٹک کرنا اور اکثر دو الفاظ کو غیر روایتی طریقے سے ربط دینا ہے۔ غالب کے اس طریقے نے بعض شارحین کو شعر کے الفاظ کے ضروری اور غیر ضروری سبب معنی لکھنے کی ترغیب دی۔ اس کی مثالیں کئی شارحین کے یہاں نظر

آتی ہیں۔ لیکن اس کی انتہائی صورت شوکت میرٹھی کی شرح میں ملتی ہے۔ غالب کے مطلع سر دیوان کے پہلے لفظ 'نقش' کے شوکت صاحب نے حسب ذیل معنی لکھے ہیں:

'نقش'۔ بالفتح مصدر لکھنا، پاؤں سے کانٹا نکالنا، مہرئی سے ناخن تراشنا، موچنے سے بال اکھاڑنا، غلط حرف یا غلط کاجیل ڈالنا، بازی کی واؤں حسب مراد آنا، ایک غراسانی ہائے کا نام جمع نقش۔ اسی طرز پر اس شعر کے ہر کلیدی لفظ کے معنی لکھے ہیں۔

'فریاد'۔ مرکب و مختلف فریاد، یاد کے آگے آنا، بادشاہ یا حاکم کو اپنی مصیبت یا دولانا۔

'شوخ'۔ بالضم بداد و معرف، کپڑے اور بدن کی میل، چمکت اور بے بھول و لبرہ جلد، چالاک، چباک و تحریر۔ لکھنا لوطی یا غلام آزاد کرنا (چونکہ لکھنے سے دل کی بات آزاد ہو جاتی ہے، اس لیے وضع جانی میں لکھنے پر تحریر کا اطلاق ہوتا ہے) عمدہ نکام کہنا، حشو و زوائد کو پاک کرنا، نکس اتارنا، گاتے وقت گلے سے نکلری نکالنا، مونے قلم سے ہار یک خط کھینچنا، حکیم وقلیدس کی مشہور کتاب کو بھی تحریر کہتے ہیں۔

'رہن'۔ ممکن ہے کہ جدا گانہ لفظ مفرد پر معنی لباس وضع کیا گیا ہو اور ممکن ہے کہ پائے راہن سے مرکب ہو کیونکہ لباس سر سے پاؤں تک انسان کی برہنگی کو (رہن) قید کر لیتا ہے۔

'بیکڑ'۔ صورت، قسم، طریقہ، سانچہ، تختہ، تصویر، صورت کھینچنا، جس کا سایہ نہ پڑ سکے۔ (سروری، ج 1)

مزید یہ کہ شعر کہتے ہوئے مرزا کو الفاظ کی مناسبتوں کا بہت خیال رہتا تھا بلکہ کہنا چاہئے کہ الفاظ کی مناسبت مرزا کے طرز اظہار کی نمایاں مفت ہے اور اس میں مرزا ایسی دودراز کی مناسبتیں نظم کرتے ہیں کہ اچھا خاصا صاحب ذوق بھی ان تک نہیں پہنچ پاتا۔ گیان چند جین نے بعض اشعار کی تشریح میں جن مناسبتوں کا ذکر کیا ہے، دوسرے بہت محترم شارحین کی نظر بھی ان تک نہیں پہنچ سکیں۔ شعر ہے:

نہ ہوئی ہم سے رقم، حیرت خط رخ یار صفحہ آئینہ، جولاں کہ طوطی نہ ہوا
جین صاحب شعر کی شرح میں لکھتے ہیں:

”اس شعر میں کئی مناسبتیں ہیں، آئینہ کو حیران بنانے میں اور ہم یار کے چہرے پر خط و کچھ کر حیرت زدہ رہ گئے۔ خط کو سبز کہتے ہیں، اس لیے آئینہ میں اس کا عکس طوطی جیسا معلوم ہوتا ہے اس کے علاوہ طوطی کو بولنا سکھاتے ہیں تو آئینہ کے سامنے پڑھاتے ہیں۔ آئینہ کے پیچھے سے ایک آدمی بول رہا ہے اور طوطی اپنے عکس کو دیکھ کر یہ سمجھتی ہے کہ طوطی آئینہ بول رہی ہے۔ اس لیے وہ بھی بولنے لگتی ہے۔ ظاہر ہے بولنے وقت کچھ حرکات بھی کرتی ہوگی۔ اس طرح آئینہ طوطی کی جولاں گاہ بن جاتا ہے۔ جولاں کہ طوطی سے مراد طوطی کے بولنے کا مقام ہوا۔“

اسی مناسبتوں کی وضاحت کے بعد ہمیں صاحب اس شعر کی شرح شروع کرتے ہیں۔ (ص: 73)
جب شاعر اپنے تخیل کی مدد سے وہ ظاہر مختلف اشیاء یا خیال میں کوئی رشتہ تشکیل دے اور وہ بھی اس شرط کے ساتھ کہ متن کے کلیدی الفاظ کے معنی کثرت تعبیر کے متحمل ہوں اور ان کے درمیان مناسبت بھی ظاہر یا مخفی ہوں تو شارح کے لیے ان کی تشریح ایک نوع کے امتحان کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور اس امتحان سے گزرتا آتما آسان بھی نہیں رہ جاتا۔ اس کے لیے اردو فارسی کی لفظیات پر غیر معمولی قدرت، دونوں زبانوں کی شعری روایت سے بھرپور واقفیت کے علاوہ استدلال کی غیر معمولی ذہنی صلاحیت بنیادی شرط کی صورت اختیار کر لیتی ہیں۔

شرحوں کے درمیان اختلاف کی ایک اہم وجہ شارحین کے بنیادی مقاصد کے درمیان اختلاف ہے۔ عہد قدیم میں بھی اس کی مثالیں ملتی ہیں کہ کوئی شارح، کسی شعر سے معنی بیان کرتا ہے تو اس کی فکر نہیں کرتا کہ خود شاعر کے شعر سے شاعر کا مقصود کیا ہے، شارح تو متن کے مناسب ترین معنی کا استخراج کرتا ہے اگر اسے یہ معلوم بھی ہو جائے کہ شاعر کا عندیہ اس سے مختلف ہے تو بھی اسے اپنی ہی شرح مناسب معلوم ہوتی ہے اور اب ہمارے زمانے میں تو اس خیال نے اصول کی شکل اختیار کر لی ہے کہ شعر اپنی تخلیقی کے بعد شاعر کی گرفت سے آزاد ہو جاتا ہے، پھر شارح کو اختیار ہے کہ وہ متن میں معنی کے امکانات کی تمام طرفوں کا جائزہ لے اور چاہے تو ایک سے زیادہ معنی

پر آمد کرے۔

لیکن اس کے ساتھ ہی شرحیات میں اس کی بھی طویل روایت ملتی ہے کہ شاعر شاعر کے مقصود معنی تک رسائی کی کوشش کرتا ہے۔ وہ متن کے ان معنوں تک پہنچنا چاہتا ہے جو شاعر کا مقصود ہیں۔ اس کی ایک صورت تو یہ ہے کہ شاعر یا قاری اگر شاعر اس کا معاصر ہو، خود شاعر سے ہی اس کے شعر کے معنی دریافت کرتا ہے۔ غالب کے خطوط میں اردو فارسی کے ملا کر تقریباً چند وہ اشعار ہیں جس کے معاصرین کے استفسار پر مرزا نے معنی لکھے ہیں لیکن ظاہر ہے اس کا کوئی امکان نہیں کہ بعد کی نسلیں اس آسانی سے مستفید نہیں ہو سکیں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ شاعر بھی سمجھتا ہے کہ تشریح کا مقصد، شاعر کے معنی مقصود کی دریافت ہے۔ نظم خطاباتی نے غالب کے مطلع:

نقش فریادی ہے کس کی شونیِ تحریر کا

کی شرح لکھتے ہوئے یہی لکھا ہے کہ غالب جو کہنا چاہتے تھے، نہیں کہہ سکے۔ نظم کی تشریح کا یہ حصہ دیکھئے:

”اس شعر میں جب تک کوئی ایسا لفظ نہ ہو، جس سے فانی اللہ ہونے کا شوق اور ہستی اعتبار سے نفرت ظاہر ہو۔ اس وقت تک اسے ہا معنی نہیں کہہ سکتے کوئی جان بوجہ کہتا ہے معنی کہتا نہیں۔ یہی ہوتا ہے کہ وزن و قافیہ کی جگہ سے بعض بعض ضروری لفظوں کی گنجائش نہ ہوئی اور شاعر سمجھا کہ مطلب ادا ہو گیا، تو جتنے معنی شاعر کے ذہن میں رہ گئے اسی کو الہامی فی ظن الشاعر کہنا چاہیے۔

اس شعر میں مصنف کی غرض یہ تھی کہ نقش تصویر فریادی ہے ہستی بے اعتبار و بے توقیر کا اور یہی سبب ہے کاغذی بزم ہونے کا۔ ہستی بے اعتبار کی گنجائش نہ ہوئی اس سبب سے کہ قافیہ مزاح تھا اور مقصود تھا مطلع کہنا، ہستی کے بدلے شونی تحریر کہہ دیا اور اس سے کوئی قرینہ ہستی کے حذف پر نہیں پیدا ہوا۔ آخر خود ان کے منہ پر لوگوں نے کہہ دیا شعر بے معنی ہے۔“ (ص: 74-75)

قلم کا اعتراض یہ ہے کہ مرزا غالب جو کہتا چاہتے تھے وہ نہیں کہہ سکے۔ غالب اس شعر کے معنی خود بیان کر چکے ہیں۔ اس لئے یہ اعتراض تو نہیں ہو سکتا کہ قلم کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ غالب کیا کہتا چاہتے تھے، اس لئے شرح کا یہ اصول ظاہر ہوتا ہے کہ شرح کا مقصد، شاعر کے معنی مقصود کا واضح کرنا ہے۔ ہمارے یہاں تنقید میں اب تک یہ طریقہ رائج ہے کہ شاعر کی سوانح، اس کے تصور شعر، یا اس کی ترجیحات وغیرہ کے متعلق جواز، اس کے کلام سے ہی فراہم کرتے ہیں۔ قلم نے غالب کے تقریباً چالیس اشعار پر اعتراضات کئے ہیں۔ ان میں سے بیشتر اعتراض کی بنیاد ہی یہ ہے کہ غالب جو کہتا چاہتے تھے نہیں کہہ سکے۔

قلم اپنے زمانے کے خاصے پڑھے لکھے استاد تھے۔ انھوں نے محمد عسکری سے انگریزی بھی پڑھی تھی اور اس معاملے میں حالی کے حامی تھے کہ نقد شعر کے لیے مغربی اصولوں کو کام میں لایا جا سکتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی مشرقی اصول نقد بھی انہیں خوب مستحضر تھے۔ ان کی شرح میں مشرقی اصول شعر و نقد کا حوالہ تقریباً ہر صفحہ پر موجود ہے۔ اس لیے ان کی شرح اصول شعر میں اختلاف کے سبب مابعد کی بعض اہم شرحوں سے مختلف معلوم ہوتی ہے۔

فن شعر کوئی کے ہار یک انا ذک ترین نکات پر قلم کی قدرت کا اظہار، ان کی تحریکوں میں بہت روشن ہے۔ اس کی روشنی میں وہ غالب کے اکثر اشعار کی تعریف بھی کرتے ہیں لیکن شعر کی سچے شعر کوئی سے مختلف تہنیتی کا رد دیتی ہے۔ شارح شعر کوئی کے نکات بہت اچھی طرح سمجھتا ہے لیکن ویسے شعر خود نہیں کہہ سکتا، جن کا وہ محاسبہ کر رہا ہے۔ اس کی ایک مثال غالب کے مصرع:

ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

پر قلم کے لگائے ہوئے مصرعے ہیں، غالب کے شعر

لکھتے رہے جنوں کی حکایات خوں چکاں ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

کی تخریج کرتے ہوئے قلم نے پہلے تو کسی مصرعہ پر مصرعہ لگانے کے فن کے متعلق بہت تفصیل

سے گفتگو کی ہے اور بتایا ہے قلم کا لفظ کس کس طرح ترکیب دیا جا سکتا ہے۔ قلم لکھتے ہیں:

”کسی مضمون کی سزا میں ہاتھ قلم ہوتا۔ یہ مضمون دوسرے مصرعہ کا ہے اور پہلے مصرعہ میں شاعر کے ذمے یہ بات ہے کہ اسے بیان کرے، جس سبب سے ہاتھ قلم ہوئے... اب جو دیکھا تو ہاتھ سے صدمہ ہاتھل سرزد ہوتے ہیں ان میں سے مصنف نے لکھنے کو اختیار کیا کہ اس سے قلم کا ضلع نہ جانے پائے... اور ضلع کے پہلو سے جو لوگ کراہت رکھتے ہیں اور اسے صنعت بمقابلہ سمجھتے ہیں وہ اکثر ضلع کو چھوڑ کر ایسے مقام پر استعارہ اور تشبیہ کو استعمال کرتے ہیں اور یہ اس سے بہتر ہے... اور ضلع کو بھی اگر دیکھئے تو لکھنے کا بھی قلم ہوتا ہے، مہندی کی بھی قلم ہوتی ہے، گلاب کی قلم اور شراب کی قلم اور عسار کی قلمیں...“

اس تمہید کے بعد قلم نے غالب کے مصرعہ ثانی پر اٹھارہ مصرعے لگائے ہیں، اس میں سے صرف چار نقل کرتا ہوں۔

پردہ اٹھا کے ہم نے تمہیں دیکھ تو لیا دشمن کے آڑے آکے دینوں میں جا کے ہم
کوہ کیا نہ دست ہوں کو شجر کی طرح نکلی شکایت آنکھ چرانے کی بار کے

ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

ذرا سا توجہ سے دیکھئے تو صاف معلوم ہوتا ہے غالب کے مصرعے

لکھتے رہے جنوں کی دکھایات خوں چنکاں

میں ہاتھ کے قلم ہونے کا سبب تخلیقی دہن اور مضمون کی عذرت کے اعتبار سے قلم کے اٹھارہ

مصرعوں پر بھاری ہے اور قلم ہی کا موقف ہے، کسی شاعر کو شعر کا پہلا مصرعہ

لکھتے رہے جنوں کی دکھایات خوں چنکاں

دیجئے کہ وہ اس پر دوسرا مصرعہ لگا دے تو تقریباً ناممکن ہوگا کہ غالب کے مصرعہ ثانی کے برابر کا

مصرعہ لگا سکے۔ اسے دو ہم مرتبہ مصرعہ فراہم کرنا بھی جس غیر معمولی تخلیقی شعور کا مظاہرہ کرتا ہے، وہ

بہت عام بھی نہیں۔ غالب نے اپنے ایک خط میں شعر کے معنی بیان کرتے ہوئے شعر کے الفاظ

اور اس کے معنی کے درمیان رشتے کی نوعیت پر بھی گفتگو کی ہے۔ ان کے مطابق ایک صورت تو یہ ہے کہ شعر میں جتنے لفظ ہوں، اتنے ہی معنی ہوں، دوسری صورت یہ ہے کہ شعر میں الفاظ زیادہ ہوں اور معنی کم ہوں جیسے مرزا کوہ کندن وکاہ بر آوردن کہتے ہیں۔ تیسری صورت یہ ہے کہ شعر میں الفاظ کم اور معنی زیادہ ہوں۔

میاں پنہ چین کی تفسیر غالب اور محسن الرحمن فاروقی کی تفسیر غالب پڑھئے تو اندازہ ہوتا ہے کہ غالب کے اشعار میں اکثر تیسری صورت سب سے زیادہ ہے یعنی کم الفاظ میں زیادہ معنی سمودئے گئے ہیں۔

نظم طباطبائی نے اپنی شرح میں اس صورت کی کئی مثالیں پیش کی ہیں جہاں کسی لفظ یا طرزِ اظہار کے سبب شعر کے معنی میں وسعت پیدا ہو جاتی ہے۔ غالب کے شعر

مجھ کو پوچھا تو کچھ غضب نہ ہوا
میں غریب اور تو غریب نواز

کی تشریح میں نظم لکھتے ہیں:

”اس شعر میں (کچھ غضب نہ ہوا) کثیر المعنی ہے۔ اگر اس جملے کے بدلے یوں کہتے کہ (مرا خیال کیا) تو مصرعہ میں اطماب ہوتا لطف ایجاز نہ ہوتا یعنی اس مصرعہ میں (مجھ کو پوچھا، مرا خیال کیا) اطماب ہے اور اس مصرعہ (مجھ کو پوچھا تو مہربانی کی) مساوات ہے اور اس مصرعہ میں (مجھ کو پوچھا تو کچھ غضب نہ ہوا) ایجاز ہے۔ اس سبب سے یہ جملہ (کچھ غضب نہ ہوا) معنی زاہد پر دلالت کرتا ہے۔۔۔“ (ظفر، ص 41)

شعری پوری شرح خاصی طویل ہے مگر اطماب، مساوات اور ایجاز کی صراحت کی مثال کے لیے اتنی عمدہ ہے کہ اسے پڑھنا چاہیے۔

شعری تشریح میں اسی طرح دوسرا مسئلہ پس منظر کے تعین کا ہے۔ یہ عام مشاہدہ ہے کہ الفاظ کی

تعمیم کی وجہ سے غزل کا شعر مختلف موقعوں پر مختلف معنی دیتے لگتا ہے۔ پس منظر کی تبدیلی سے غزل کا معشوق، جسے شعر اعام طور پر وہ، تم جیسے (Pronoun) یا سا وہ، ظالم و ظمیرہ صفات کے ذریعہ لفظ کرتے ہیں جو معنی صوفیاء کے لیے دیتے ہیں وہی معنی عاشقوں کے لیے نہیں دیتے اور بعض مرتبہ تو خود شاعر شعر کا ایک مخصوص پس منظر تیار کرتا ہے تاکہ شعر کا مقصورہ معنی برآمد ہو سکے۔ گیان چند جین نے۔

صد چلی کدہ ہے صرف جہین غربت

ہر بن میں ہے اخیار شرر طور ہنوز

کی تشریح میں لکھتے ہیں:

”اس دنیا سے انسان اس میں دنیا میں آیا ہے۔ یہاں وہ اجنبی اور مسافر

ہے اس کی بیٹائی میں اب بھی ہزار چلیاں ہیں۔ اس کے ہر بن میں اب بھی شرر

طور کا ٹھہار یعنی نور الوہیت موجود ہے۔ خدا نے آدم کی بیٹائی میں مسافر کے

پروں پر ٹھہار ہوتا ہے۔ یہاں شرر طور کا ٹھہار ہے۔“ (222)

قاری پر جب تک یہ واضح نہ ہو کہ شعر آدمی کے دنیا میں آنے کے تصور کی بنیاد پر لفظ کیا گیا ہے

تب تک متن میں غربت کے اشارے کا تعین نہیں ہو سکتا۔ بعض شارحین اپنی طرف سے کوئی نیا

پس منظر بنا کر شعر کی تشریح کرتے ہیں تو شعر کے ایسے معنی برآمد ہوتے جو اکثر دوسرے

شارحین کے لئے قابل قبول نہیں ہوتے۔ گیان چند جین نے کئی اشعار میں مبداء باری آسی کی شرح

سے اسی بنیاد پر اختلاف کیا ہے۔

کلام غالب کی طرف شارحین کی کشش کے اتنے اسباب بیان کر لینے کے بعد بھی یہ خیال ہوتا

ہے کہ ان اسباب کے علاوہ غالب کے یہاں اور بھی کچھ ہے، جو تجزیہ کی گرفت میں نہیں آتا، مگر

اس حیرت سرائے شاعری کے لئے ہمارے تجسس کو کم نہیں ہونے دیتا۔



چاویہ رحمانی

غالب تنقید آل احمد سرور

ترقی پسند تنقید میں آل احمد سرور ایک خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ ان کی تاریخ پیدائش 9 ستمبر 1912ء ہے۔ 1 جون 1928ء میں کوئٹہ کنوویہ ہائی اسکول غازی پور سے میٹرک کیا اور جولائی 1927ء میں سینٹ جانسن کالج آگرہ میں داخلہ لیا۔ جہاں سے جون 1932ء میں بی ایس سی (سائنس) کا امتحان پاس کیا اور اکتوبر 1932ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ایم اے (انگریزی) میں داخلہ لیا۔ 2 علی گڑھ یونیورسٹی (اردو) کے نومبر 1932ء میں ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ مئی 1936ء میں اردو میں ایم اے کیا اور جولائی 1936ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں لیکچرر ہو گئے۔ مارچ 1945ء میں رضا انٹر کالج راجپور کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ اگست 1946ء میں شعبہ اردو لکھنؤ یونیورسٹی میں ریڈر ہوئے۔ 1950ء میں اردو ادب علی گڑھ کے ایڈیٹر ہوئے اور یکم دسمبر 1955ء کو شعبہ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں سید حسین ریسرچ پروفیسر مقرر ہوئے۔ 20 جنوری 1956ء کو انجمن ترقی اردو (ہند) کے جنرل سکریٹری کا عہدہ سنبھالا۔ یکم مئی 1958ء کو شعبہ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے صدر مقرر ہوئے اور یکم اگست 1958ء کو شعبہ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ انھوں نے مشرقی اور مغربی ادب کا گہرا مطالعہ کیا تھا اور اس کا اثر ان کی تحریروں میں صاف طور پر محسوس ہوتا ہے۔ وہ مولوی عبدالحق سے بہت متاثر تھے اور جیسا کہ ہم جانتے ہیں مہدی القادی نے مولوی عبدالحق کو مقدمہ باز کیا تھا۔ شاید آل احمد سرور میں مقدمہ بازی کا انداز مولوی عبدالحق کی قربت کا نتیجہ ہے۔ انھوں نے ادب کے بے حد اہم موضوعات و مسائل پر قلم اٹھایا لیکن کمال اختصار کے ساتھ اور جو موضوعات سنجیدہ اور مستقل غور و فکر اور مفصل اظہار خیال کا مطالعہ کرتے تھے، ان سے بھی سرسری گزر گئے۔ اس طرح

ان کی تنقید غزل کی طرح اشاروں اور کنایوں کا آرٹ بن گئی۔ جس میں کام کی باتیں بہت ہیں لیکن ان کی تلاش بھی بڑا کام ہے جو بڑی فرصت محبت اور ذہانت چاہتا ہے۔

آل احمد سرور نے غالب کی شاعری اور شخصیت پر بھی وقتاً فوقتاً اظہار خیال کیا ہے۔ ان کا ایک مضمون ”پورے غالب“ ہے۔ جو شعبہ اردو علی گڑھ کی پیش کش ”عرفان غالب“ میں شامل ہے۔ اس مضمون کی تفصیل آل احمد سرور کے ہی الفاظ میں ملاحظہ فرمائیں۔

”میرے مضمون پورے غالب میں جیسا کہ شروع میں بھی کہا گیا ہے غالب کے غزلوں کی روح تک پہنچنے کے لیے نوزمید یہ کے مطالعے کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ غالب کی عظمت میرے نزدیک اس بات میں ہے کہ ان کے پاس دل کی آنکھ بھی ہے اور سیرالہ زار بھی۔ غالب وہاں سے زیادہ ذہن کے شاعر ہیں۔ یہ کہتا درست نہیں کہ غالب کے یہاں اردو پن نہیں ہے ہاں غالب کے اردو پن اور اردو کے اردو پن میں فرق ہے۔ آرزو کا اردو پن ہڈی کا ساتھ دے سکتا ہے غالب کا اردو پن افس و آفاق کے آیات تک پہنچ سکتا ہے فرض جب تک ہم پورے غالب کا مطالعہ نہ کریں ہم غالب کی عظمت کو نہیں سمجھ سکتے۔“

اس مضمون میں کئی باتیں محل نظر ہیں۔ اول تو ”اردو پن“ ہی کوئی ایسی قدر نہیں جو اچھی یا بڑی شاعری کے لیے ناگزیر ہو۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ذوق کے یہاں ”اردو پن“ ہے لیکن وہ بڑے شاعر نہیں ہیں۔ داغ اور آرزو بھٹوی کے یہاں ”اردو پن“ ہے لیکن ان کی شاعری کو بڑی شاعر کے زمرے میں رکھنا بہت مشکل ہے۔ لہذا اردو پن کے مسئلے پر سرکھپانا بیکار ہے اس طرح وہ ادب کی تعریف بیان کرتے ہیں اور کہتے ہیں۔

”اس کا مقصد نہ علم میں اضافہ کرنا ہے نہ معلومات دینا ہے نہ واقعات بیان

کرنا ہے سراسر کا مقصد تخلیقی تجربے کی ترسیل ہے۔“

کوئی تخلیقی تجربہ علم سے معرئی نہیں ہو سکتا۔ علم میں اضافہ ادب کا مقصد نہ ہو لیکن تخلیقی تجربہ

.. بہر حال علم میں اضافہ کرتا ہے۔ وہ اہلیت کا ایک بیان نقل کرتے ہیں۔

”اہلیت نے کہا تھا کہ فن کو ہر کمالی معیاروں سے جائے گا مگر اس کی بڑائی

دوسرے معیاروں سے متعین ہوگی۔۔۔ ایلٹ یہاں زندگی کی بصیرت کی بات کرتا ہے۔ اس کے نزدیک فن میں بڑائی اس نظر سے زندگی سے آتی ہے جو قادری کو مربوط، پہنچتے اور حقیقی تجربہ پر مبنی معلوم ہو یعنی سوال کسی اخلاقی یا سماجی نظریے سے اتفاق کا نہیں بلکہ اس کی پختگی اور گیرائی اور اس میں پوری طرح فرق ہونے کا ہے بڑی شاعری مذہبی، سماجی، متصوفانہ، اخلاقی، فلسفیانہ کبھی کبھار ہو سکتی ہے، مگر اپنے من میں ڈالنے کی وجہ سے، نہ کہ کسی بڑے فلسفے یا نظریے کی وجہ سے۔“

میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ آل احمد سرور نے ایلٹ کا وہ مضمون پڑھا نہ ہوگا لیکن جس سادہ لوحی سے نقل کیا ہے اس پر تعجب ضرور ہوتا ہے۔ جس الرحمن فاروقی نے اس سادگی پر روشنی ڈالی ہے۔ اگرچہ آل احمد سرور کا نام نہیں لیا اور ہم جانتے ہیں کہ فاروقی صاحب کو حسن عسکری، آل احمد سرور اور احتشام حسین کی کمزوریاں یا دو کم ہی آتی ہیں۔

”ایک اور صاحب نے ایلٹ کا ایک قول کہیں سے ڈھونڈ کر ۶۷ فقرہ مباحثات سے پیش کیا کہ ممکن ہے ادب اور غیر ادب میں فرق کرنے کے لیے ادبی معیاروں کا حوالہ دینا چاہیے۔ لیکن کوئی ادب بڑا ہے کہ نہیں اس کا تعین غیر ادبی معیاروں کے ہی ذریعے ہو سکتا ہے۔ اول تو یہ کیا ضرور ہے کہ ایلٹ جس کی ہزاروں باتیں ان صاحب کو غلط معلوم ہو رہی ہیں، یہی ایک بات سمجھ کیے، اور دوسرے یہ کہ اگر یہ صاحب ایلٹ کے پارے نظام فکر سے واقف ہوتے تو انہیں معلوم ہوتا کہ اس مضمون کے آخر میں جہاں آپ نے یہ بات کہی ہے کہ ایلٹ نے تلقین کی ہے لوگوں کو عیسائی ادب پڑھنا چاہیے کیونکہ وہی عظیم ترین ادب ہے۔۔۔ ہمارے ہمارے ایلٹ نے ایلٹ کے حوالے سے یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ غیر ادبی معیاروں کی رو سے ہی ادب کی عظمت کا پتہ چلتا ہے لیکن یہ بھول گئے کہ ان ہی میں سے بعض معیاروں کی روشنی میں ایلٹ نے عیسائی ادب کو عظیم ترین دیکھ دیا ہے۔ کسی دوسرے غیر ادبی معیار کی رو سے جن شکلیں یا مہاسہائی کسی اور ادب کو عظمت کے تخت پر بٹھا دے گا،

جماعت اسلامی والا کسی اور لوہے کے گن گائے گا۔“ 8

اس مضمون میں کئی اہم نکتے بھی ہیں۔ جن تک آل احمد سرور کا ہی ذہن پہنچ سکتا تھا لیکن ان کی توضیح کا فقدان نکلتا ہے اور محسوس ہوتا کہ آل احمد سرور ان کی اہمیت سے آگاہ نہیں تھے۔ مثلاً وہ غالب کی ابتدائی شاعری کے بارے میں لکھتے ہیں:

”عالی جہاں لطف کی کمی پاتے تھے وہاں کثیفہ معنی کا ایک طہم دریافت کرتے ہیں جو فتح ہو جاتا ہے تو دوح کو ایک بالید کی اور ذہن کو ایک شادابی بخشتا ہے۔“ 9

اس طرح وہ تکنیک کے بارے میں لکھتے ہیں:

”یہاں تکنیک ایک نئے ایمان کی تلاش، حقیقت گوشت میں ہڈی دریافت کرنے کی کوشش اور نفسیاتی ژرف بینی، مختلف حقائق کو الٹ پلٹ کر ان کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کا دوسرا نام بن جاتی ہے۔“ 10

یہ بات اتنی غیر اہم نہیں کہ اس قدر سری طور پر بیان کی جائے۔ لیکن آل احمد سرور اور ان کے تجربے سے گریز کرتے ہیں۔ اسی طرح وہ لکھتے ہیں:

”غالب بھی جذباتی نہیں ہوئے۔ جذبے سے انھوں نے آج لے لی مگر اس آج سے آئندہ لوگوں کے قلم کدے میں حراج کا اجالا بھی کیا۔ ان کے یہاں وہ ذہن ہے جو واقعات و حادثات سے نتائج اخذ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ بحر ان کے یہاں مختلف قسم کے تجربات بھی ہیں۔ پھر ایک خاص ذہن بھی، خواہ بخشش کی سبھی چیز انہیں نکلتے تک لے جاتی ہے۔ ان کا ساتھ بھی ہر قسم کے لوگوں سے چڑتا ہے، دیکھنا، مذاہن، عالموں سے، مندوں سے، سپاہیوں سے، ہونٹوں سے، ہندوؤں سے، مسلمانوں، عیسائیوں سے، غیر ملک سے آنے والے افسروں سے۔ ان سے پہلے کسی شاعر کا حلقہ اتحاد پہنچ نہیں ہے، نہ مسلمانوں کے گہرے روابط ہیں۔ چنانچہ جیسا کہ گے نے کہا ہے وہ باہر دیکھتے ہیں اور ان کے اندر درخت نشوونما پاتا ہے“ معاملہ صرف خارجی حقائق کا نہیں، خارجی حقائق کے ایک شخصیت سے باطنی رابطے کا ہے۔“ 11

یہ کسی کام کی باتیں ہیں لیکن بجائے تنقید غزل کا روپ دھار لیتی ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ غالب کی شخصیت ایسی بھرپور تھی جو کسی اور شاعر کے یہاں نہیں ملتی اور لکھتے ہیں:

”اس بھرپور شخصیت کا لازمی حصہ تجمائی ہے اور غالب کی یہ شاعری مردم
بیزاری کی وجہ سے نہیں، آدمیوں میں رہتے ہوئے، اپنے ایک الگ وجود اور الگ
دنیا پر اصرار کی وجہ سے ہے۔ اس تجمائی نے ان کو ہر مروج کے ساتھ پہنے نہ دیا، نہ
جھوم میں کھونے دیا۔ اس لیے انہیں پابندی (Dependence) کے بجائے
آزادی (Independence) سکھائی۔ اس نے ان کی انفرادیت کو چمکایا اور
اس انفرادیت کو آقا قیامت کی ایک گونج بنا دیا۔“ 12

یہ وہ اہم نکتہ ہے جس تک کسی عام ذہن کے نقاد کی رسائی ممکن نہیں اور آل احمد سرور نے اب
سے کوئی دو دہائی پہلے اس راز کو پالیا لیکن یہ بھی ان کی تن آسانی کا شکار ہو گیا۔
حواشی:

1۔ ڈاکٹر سلطان احمد، توقیت سرور، ارمغان سرور 2001ء، دہلی: انجمن ترقی اردو (بند) ص

2۔ ایضاً ص 76

3۔ ایضاً ص 68-69

4۔ ایضاً ص 69

5۔ آل احمد سرور، عرفان غالب (تعارف)۔ 1973ء، نئی گڑھ: یونیورسٹی پبلی کیشنز ڈو جین

6۔ آل احمد سرور، پورے غالب، فکر و نظر مارچ 2006ء، نئی گڑھ: اے ایم یو پریس ص 138

7۔ ایضاً ص 139

8۔ خمس الرحمن فاروقی، جدید ادبی تنقید: شاعر ہم عصر اردو ادب نمبر 1977ء، بمبئی شاعر ص 52

9۔ آل احمد سرور، پورے غالب، فکر و نظر مارچ 2006ء، نئی گڑھ: اے ایم یو پریس ص 141

10۔ ایضاً ص 144

11۔ ایضاً ص 145



ویک ہدی

جوگندر پال کی تخلیقی کائنات

جوگندر پال بیسویں صدی کے اہم کٹھن نگار ہیں۔ جنہوں نے آنکھیں تو سرحد کے اس پار کھولیں مگر وجود کا دکھ درد سرحد کے اس پار جمیلا۔ ایک ایسے قلم کار جنہوں نے بچپن میں گھر گھر دودھ ہائٹ کر گزر بسر کی پھر بھی دل میں علم کی جوت کو بجھنے نہ دیا۔ انہوں نے افسانے بھی لکھے اور افسانے بھی، ناول بھی لکھے اور ناول بھی، سفر نامے بھی لکھے اور تنقیدی کتابیں بھی۔ لیکن غور سے دیکھا جائے تو ان کی اختصار پسندی نے صنفِ افسانوں میں ایک نئی روح پھونک دی۔ ان کے یہاں نہ صرف ہندوستان کے پرانے سماج کی کہانیاں اپنی اساطیری و تہذیبی سیاق و سباق میں دستیاب ہیں بلکہ افریقہ کی قبائلی زندگی اور یورپی استبداد کی داستانیں بھی ملتی ہیں۔

5 ستمبر 1925ء کے دن غیر منقسم ہندوستان کے شہر سیالکوٹ (پنجاب) میں جسے جوگندر پال نے بنیادی تعلیم تو اپنے وطن میں اردو زبان کے ذریعے حاصل کی مگر تقسیم ہند کے باعث انہیں بائیس سال کی عمر میں ہجرت کر کے اقبالہ میں استقرار کرنا پڑا۔ والد نے دودھ پیچنے کا پیشہ اختیار کیا جب کہ جوگندر پال ان کا ہاتھ بٹاتے رہے اور صبح سویرے سائیکل پر بیسیوں کلو میٹر دور جا کر دودھ پانتے رہے۔ بعد میں انہوں نے ایم اے (انگریزی) کی ڈگری حاصل کر لی اور ایک کینیائی لڑکی سے شادی کر کے نیروبی، افریقہ چلے گئے جہاں وہ ایک اسکول میں بطور استاد مقرر ہوئے۔ چند برس افریقہ میں رہ کر واپس ہندوستان کا رخ کر لیا اور پھر اورنگ آباد کے ایک پرائیوٹ کالج میں پروفیسر اور بعد میں پرنسپل کا عہدہ سنبھال لیا۔ 1978ء میں ریکائر ہو کر واپس آئے اور آخری وقت (22 مارچ 2016ء) تک اپنا مستقر بنالیا۔

جوگندر پال کی مادری زبان پنجابی تھی اور ایم اے کی ڈگری انگریزی میں حاصل کی تھی تاہم انھوں نے اظہار خیال کے لیے اردو زبان کو ترجیح دی۔ ان کی پہلی کہانی ’تھاگ سے پہلے‘ 1945 میں شاہد احمد علوی کے رسالے ’ساقی‘ میں شائع ہوئی۔ وہ اپنے افسانوں کی شروعات میں ’حیرا ہی حیرا‘ لکھنے کے عادی تھے جس کا جواز وہ یوں پیش کرتے تھے کہ سب سے بڑا خالق اس دنیا کی تخلیق کر کے خود غائب رہتا ہے۔ اس لیے تخلیق کار کو بھی اپنی تخلیق سے غائب رہ پانے کا ادراک اور حوصلہ نصیب ہونا چاہیے۔ ان کے افسانوں کے بارے میں انور مسدید فرماتے ہیں:

”جوگندر پال کے افسانے زندگی کی انوکھی جگی دار راتوں کو ہمارے سامنے لاتے ہیں اور ایک جہاں دیگر روشن کر دیتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ راجندر سنگھ بیدی کی وفات سے جو ٹھکا پیدا ہوا تھا وہ جوگندر پال کے فن نے پورا کر دیا ہے۔“

(انور مسدید، ماہنامہ اردو فرووری مارچ 2006، ماہوار اردو افسانہ۔ عہد بہ

عہد، ص 18)

جوگندر پال کی تخلیقات کی فہرست یوں ہے: (1) افسانے: دھرتی کا کال 1961، میں کیوں سوچوں 1962، رسائی 1968، مٹی کا ادراک 1970، لیکن 1977، بے محاورہ 1978، بے ارادہ 1981، جوگندر پال کے منتخب افسانے (ہندوستان 1987 / پاکستان 1989)، ٹکلا 1989، مکھو دو بابا کا مقبرہ 1994، جوگندر پال کے افسانوں کا انتخاب 1996، جوگندر پال کے شاہکار افسانے 1996، بستیوں 2000، افسانچے: سلوٹس 1975، کٹھا گھر 1986، چمکے 1991 (3) ناولٹ: آمد و رفت 1975، بیانات 1975، (4) ناول: ایک یونگ لہو کی (پاکستان 1963 / ہندوستان 1964) ناول: Blind: 1983، خواب رو (پاکستان 1990 / ہندوستان 1991، Sleep

Walkers)، پارہ ۱ پر 2004ء، Black Water، (5) انتقادات: رابطہ 1997ء، ہے اصطلاح 1998ء۔

جوگندر پال کی تخلیقات میں افریقہ، پاکستان اور ہندوستان میں بچے کردار جیتے ہیں، جدوجہد کرتے ہیں اور اپنے وجود کی بازیافت کرتے ہیں۔ ان کی بیشتر کہانیاں ہمیں اسطوری اور طلسمی دنیا کی سیر کراتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں کے مجموعے ’منٹی کا ادراک‘ کے گرد پوش پر یہ عبارت درج ہے:

”شاید اسی لیے جو کوئی بھی اس کہانوں کی دنیا میں داخل ہوتا ہے، وہ لوٹنا

بھول جاتا ہے اور ایک افسانوی حقیقت کے ماحول میں کھو جاتا ہے۔“

جوگندر پال کو نہ صرف حال پر بلکہ ماضی اور مستقبل پر بھی نظر رہتی ہے جن کو وہ زنجیر کی کڑیوں کی طرح جوڑتے ہیں۔ وہ غریب استحصال زدہ افریقی قبائلوں کا دکھ درد اسی شدت سے محسوس کرتے ہیں جتنا کہ اپنے ہم وطن مہاجرین کا۔ جوگندر پال دفن و جذبات میں نہیں بہتے بلکہ ہجرت کے کرب، بے زمینگی کے درد اور خانہ بدوشی کے غم کو صلیب قرطاس پر آہستہ روی سے نقش کرتے ہیں۔ بقول جوگندر پال ”وہ کہانی جیتے ہیں اور اس کا درد اپنے اندر سموتے ہیں۔“ انھوں نے ترقی پسند دور میں آنکھیں کھولیں اور چنانچہ خود ان گنت مصائب کا شکار ہو چکے تھے، اس لیے ترقی پسندوں کے ہموار بن گئے، مگر یہ ہم سفری زیادہ دیر برقرار نہ رہ سکی اور ان کا جھکاؤ دھیرے دھیرے جدیدیت اور اختصار پسندی کی جانب پڑتا گیا۔ بہت ممکن ہے کہ اس کی وجہ ان کی انگریزی ادب سے مسلسل وابستگی رہی ہو جس نے ان کے ذہن میں نظریات اور اسلوب کے نئے دروا کیے ہوں گے۔ انھوں نے اپنا ایک مخصوص اسٹائل اور لب و لہجہ اختیار کیا جو مروجہ اسلوب سے کافی ہٹ کر تھا۔ فرماتے ہیں کہ ”ایک زندہ کہانی کبھی ختم نہیں ہوتی، کتاب بھلے ہی ختم ہو جائے مگر قاری کے ذہن میں کہانی اس کے بعد شروع ہوتی ہے۔“ پروفیسر وہاب اشرفی اپنی تصنیف ’ما بعد جدیدیت‘، مضمرات و ممکنات‘ میں رقم طراز ہیں:

”کھلا ہوا ذہن، بہت تعصب لگا، اخلاقی کیف، یہ سب جو گنڈر پال کی زندگی کا حصہ ہیں۔ ضروری نہیں کہ شخصیت کا عکس تحریر ہی بھی ہو لیکن مجھے محسوس ہوتا ہے کہ پال ہمیشہ زندگی کے اس کنارے پر کھڑے نظر آتے ہیں جہاں زندگی کی تمام تر قباحتوں کو دیکھنے پر مجبور ہوتے ہیں لیکن انہیں برداشت کرتے ہوئے رہائی کیف میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ ان کے یہاں روشنی کی حاش کا بھی مسئلہ ہے جو کئی دوسرے افسانہ نگاروں کے یہاں آج بھی بہت شدت اختیار کر چکا ہے۔“

جو گنڈر پال کے افسانوں اور افسانہجوں میں موضوعات کی بوجھبوجھ مطلق ہے۔ انگریزی کا طالب علم ہونے کے باعث ان کا مطالعہ تو وسیع ہے ہی، اس کے علاوہ ہندوستان میں پچھلے سماجی، سیاسی، معاشی اور مذہبی انتشار کا بڑی گہرائی سے مشاہدہ کرتے رہے ہیں۔ انہوں نے کرداروں کا بھی بڑی ہنرمندی سے نفسیاتی تجزیہ کیا ہے اور پھر اپنے افسانوں کی زینت بنایا ہے۔ الہت ایسا کرتے ہوئے انہوں نے کرداروں کی نفسیاتی گہرائی کو کبھی سمجھانے کی کوشش نہیں کی بلکہ اس کو کاری کی ذہانت پر چھوڑ دیا۔ ان کے کچھ افسانوں کے موضوعات یوں ہیں: آگنی کا کرب [بیک لین، حرا ہے، رسائی، پناہ گاہ]، خیر و شر [پادشاہ]، نرینہ جبری سماج میں زنجیروں میں جکڑی عورت [مہا بھارت]، مرد و اساس سماج میں عورتوں کو چند پٹھے اختیار کرنے پر پابندی [خلا باز]، ذیابیطس بیمار کی حاطہ زار اور انسانی لاطعلقی [قیاس]، رشتوں کی بے ثباتی [دومنٹ کی خاموشی] پیارا اور تیاگ [ک۔ ک۔]، اندیشہ زوال [غروب]، غربت، تنہائی اور بے روزگاری [بازار]، عمر رفت کے اعترافات، پریچر رین [طسم ہوشربا]، بسوں کے سفر کی صعوبتیں [سواریاں]، ایلو راگیمیاؤں میں پوشیدہ زندگی کے اسرار و رموز [منی کے ادراک]، تخلیق کار اور تخلیق کارِ رشتہ [سراپا]، افسر شامی کی بدعنوانیاں، وجودی کشش [بیچ]، تقسیم وطن کا درد [ڈیرا بابا ناٹک]، امریکہ روس کی باہمی رس کشی اور سرد جنگ، سرحد پر دشمنوں

کے سچ محبت کا پروان چڑھنا [نیلی سکوپ]، دہشت گردی (آخری پاٹھ، سانس سمندر)، خلا کا سفر، چاند کی تفسیر اور مریخ پر پہنچنے کا منصوبہ وغیرہ۔ افسانہ نگار نے کئی افسانوں میں خلا کو بطور علامت پیش کیا ہے۔ افریقہ کی زندگی کو بھی انہوں نے دقیقہ شناسی سے دیکھا، پرکھا اور سمجھا ہے اور وہاں کے حالات پر کئی دسوز کہانیاں تحریر کی ہیں جیسے مجروحہ دھرتی کا کال، پرش اور پشور وغیرہ۔ ان کے یہاں اساطیر کا کافی عمل دخل رہتا ہے جیسے رامائن، میں اسی رز ہے کے کردار، عفریت، میں راون کی اصلیت کو بے پردہ کرنے کی کوشش اور اٹھارہ ادھیائے میں موجود تھنڈی تصادم کو گیتا کے اہدیش کے پس منظر میں پیش کرنا۔ 'بیک لین' میں بھی اعلیٰ سوسائٹی کی کارکردگی اور جنسی کجرویوں کی عکاسی کی گئی ہے۔ شاہکار افسانہ 'شرادھ' بھوک کا استعارہ بن کر ہمارے سامے آتا ہے۔ افسانے میں ہندو معاشرے کی مردہ پرستی، روایات، اعتقادات اور اوبام پرستی کا بڑی دقیقہ ریزی سے جائزہ لیا گیا ہے اور اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ انسان کو چاہیے کہ مردوں کے بدلے زندہ مفلس اور حاجت مند لوگوں کی دست گیری کرے۔ افسانے میں راوی مردہ روحوں کے لیے بازار سے انگو خریدا ہے مگر غریب نادار بھکاریوں کو دیکھ کر سوچ میں پڑ جاتا ہے۔ "ہاں کا دھواں غلط نہیں، مردے اپنی بھوک مٹانے کے لیے پلٹ پلٹ کر دنیا کی طرف آتے ہیں۔ اگر زندہ انسان اپنی خواہشات کے تابوت بن سکتے ہیں تو یہ کوئی مجروحہ نہیں کہ مردے زندہ انسانوں کی طرح تابوتوں سے باہر نکل آئیں۔" دراصل افسانہ نگار کو یہ احساس ہے کہ غریب لوگ بھوک کی وجہ سے ہمیشہ کھانے پینے کے لیے ترستے ہیں اور ان کی ترستی روچیں جب کوچ کر جاتی ہیں تو مڑ مڑ کر دیکھتی ہیں کہ کاش ان کو بھی پیٹ بھر کھانا مل جاتا۔ یہ بھوک روحوں کی نہیں بلکہ ان جسموں کی ہے جو زندہ لاشوں کی طرح اس دھرتی پر چلتے پھرتے ہیں اور اپنی ترستی نگاہیں ہر اس چیز پر ڈالتے ہیں جو ان کے نصیب میں نہیں ہوتیں، کبھی کبھار وہ اپنی خواہشوں کا اظہار اپنے پرچار میں کر لیتے ہیں اور ان کے وارث زندگی میں نہیں تو کم از کم مر کر ان کی ترشیا (خواہش) کو کچھ حد تک مٹانے کی کوشش کرتے

ہیں۔ افسانے کا خوبصورت موڑ جب آتا ہے جب راوی گھر لوٹنے سے ایک ضعیف جوڑے اور ان کے ساتھ ایک کسمن بچی کو دیکھتا ہے اور ان میں اپنے دادا، دادی اور بہن نکلی کی شبیہ پاتا ہے۔ جذبات سے مغلوب ہو کر سے رہائشیں جاتا اور وہ شرادھ کے لیے خرید ہوا انگور کا لفافہ اس بیمار زرد چہرے والی بچی کو دے دیتا ہے اور ان دو بزرگوں سے کہتا ہے کہ ”چلیے“ ماں آپ کا انتظار کر رہی ہے۔“ اسے لگتا ہے کہ اس کے دادا اور دادی اور بہن پھر سے جنم لے کر واپس زمین پر اترے ہیں اور ماں ان ہی کا انتظار کر رہی ہے۔

جوگندر پال کے یہاں درد مندی اور ہم گدازی کا شدید احساس ملتا ہے۔ ان کے یہاں بچن میں بیٹھی تنہائی سے جو جیتی عورت اپنے چولہے، آٹے، برتنوں، نمک، دانی اور دیگر اشیا سے ہم کلام ہوتی اور تقسیم وطن کے بکھراؤ کا استعارہ بن کر سامنے آتی ہے۔ جوگندر پال کا خیال ہے کہ حقیقت سائنس کی گرفت سے باہر ہے۔ یہ خیال اکثر وہ لوگ اپناتے ہیں جو غیر سائنسی فلسفے کے زیر اثر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کئی افسانوں میں کائنات کی بناوٹ، انسانی وجود کی حقیقت اور زیست و موت پر بحث چھڑ جاتی ہے جو کبھی کبھی ایسے افسانوں کو جو جمل بناتی ہے۔ خالد سہیل کے ساتھ ایک انٹرویو میں جوگندر پال فرماتے ہیں:

”میرے لیے کہانی لکھنا دھند میں گاڑی چلانے کی طرح ہے۔ قادی میرا مسافر میرے ساتھ چل رہا ہوتا ہے۔۔۔۔۔ کہانی لکھنا اور پڑھنا دھیرے دھیرے انکشاف کا عمل ہے۔“

ناولوں میں بھی جوگندر پال نے علامتوں اور استعاروں کا استعمال کیا ہے جن سے تہذیب و ثقافت کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ طرزِ تحریر میں یہاں بھی اختصار سے کام لیا گیا ہے۔ پہلا ناول ’ایک بوند لہو کی قیامِ افریقہ کے دوران لکھا گیا۔ دو دہائیوں کے بعد دوسرا ناول ’نادید‘ منظر عام پر آیا جو امیر جنسی کے ناظر میں لکھا گیا۔ اس ناول میں ملک کے محام کو نا بیٹا دکھایا گیا ہے اور ان کے سیاسی رہنما بیٹا ہونے کے باوجود اپنے فقی مفاد کے لیے نا بیٹائی کا ڈھونگ رچاتے

ہیں تاکہ وہ خود کو عوام سے جوڑ سکیں۔ ناول میں غیر ملکی ایجنسیوں کے نمائندوں کا رول بھی دکھایا گیا ہے۔ مایا کوس، افریقہ میں تاجیواؤں کے ایک گھر کو دیکھ کر ناول نگار اسنے متاثر ہوئے تھے کہ ایک پورا ناول اسی پر رقم کیا۔ یہ ناول ایک ایسے گمر کی کہانی ہے جس میں بھی تاجیوا ہیں، اس کے باوجود محبت، پیار، حسد اور رشک جیسے جذبات سے بے خبر نہیں۔ دراصل آنکھیں رکھنے والے حرم وہیں کے سبب اپنے باطن کی روشنی کو نکھو دیتے ہیں۔ ناول خراب روڈ میں جو گندہ پال نے کراچی کے ایک لکھنؤی مہاجر کا کرب بیان کیا ہے جو اپنی ثقافتی اساس لکھنؤ میں چھوڑ آتا ہے مگر نہ تو وہاں کے گلی کو چوں اور چوک کو بھول پاتا ہے اور نہ ہی بلج آباد کے آدموں کی خوشبو کو۔ بقول نور سدید:

”ناول خواب رو میں جو گندہ پال نے پاکستانی ادیبوں سے کہیں زیادہ

پاکستانی ہونے کا ثبوت دیا ہے۔“

جو گندہ پال کا آخری ناول پار پرے کے عنوان سے شائع ہوا جس میں سماجی و سیاسی مفارقت کے شکار ہجر مسوں کو فوکس کیا گیا ہے جو مختلف جرائم کے سبب ہندوستان سے کالا پانی بھیجے جا چکے ہیں اور وہاں پر اپنی ہی دنیا آباد کر رہے ہیں۔ کالا پانی سیلور جیل کے یہ قیدی انڈمان جزیرے پر بس جاتے ہیں اور ایک نئی دنیا کو تشکیل دیتے ہیں جس میں غلوں و محبت ہے اور آپسی امدادی ہے۔ نہ طبقاتی اونچ نیچ ہے۔ نہ مذہبی تفاوت ہے اور نہ ہی نفرتیں ہیں۔

جو گندہ پال کے افسانوں اور ناولوں میں جا بجا علامتیں اور استعارے ملتے ہیں۔ وہ اختصار کو افسانے کی جان سمجھتے ہیں جو کسی ابہام و ایہام کی گھما گھم نہیں چھوڑتے اور حشو و زائد سے پرہیز کرتے ہیں۔ ان کا یہ ماننا ہے کہ کہنے سے زیادہ ان کا موثر ہوتا ہے۔ جو گندہ پال نے اختصار کو ایک خاص لائحہ عمل کے تحت اپنایا ہے۔ انھوں نے ’صنف افسانچہ یا منہی کہانی‘ کی ترویج میں بہت بے لگدان دیا ہے۔ یہ ان کی کوششوں کا ہی نتیجہ ہے کہ اردو ادب میں افسانچہ نگاروں کا ایک کارواں چل پڑا جو ہنوز جاری ہے۔ ادب میں اختصار پسندی کے بارے میں

جو گنبد پال فرماتے ہیں:

”آپ غور کریں تو زیادہ بول چال کر ہم کاری کو کہانی میں شامل ہونے سے روکے ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس کہانی کو چپ چاپ جان کیا جاسکے تو کتاب پوری ہو لینے کے بعد بھی پڑھنے والے کے ذہن میں چلتی رہتی ہے اور اپنے منے سے قدموں سے چل چل کر بحرِ اس کا ساتھ دیتی ہے۔... کج پوچھیں تو اب مجھے کسی ایسی تخلیقی تدبیر کی سوجھ بوجھ درکار ہے جس کی بدولت بولے بغیر ہی اپنی ساری کہانی کہہ پاؤں۔ کچھ لکھ کر جینا بھی کیا جینا؟ جی جی کر جینا کیوں نہ ہو؟..... ہاں لکھنے والوں کو لکھنا تو ہوتا ہی ہے، سواکتا اور ایسے لکھو کہ قلمِ حسیٹ حسیٹ کر کھستے چلے جائے کی بجائے تمہارے ایک ذرا کچھ پانے پر خاموشی اور گہری ہو جائے اور پڑھنے والے کو تمہاری مداخلت درپیش نہ ہو اور حسیٹیں پڑھتے ہوئے گویا خود بخود لکھ رہا ہو۔۔۔ ساری زندگی کی فن کاری کے بعد واضح پر یہ ہوا ہے کہ میرے کردار مجھ سے بہتر فن کار ہیں اور میرا کام بس یہی ہے کہ میری ایسی چوڑی تحریروں سے ان کے جینے جھیلنے میں شل واقع نہ ہو۔ اپنی ایسی ہی سوچوں کے باعث میری اختصار پسندی نے مجھے افسانے کی ممکنات کی طرف برابر متوجہ کیے رکھا، یہاں تک کہ کوئی ضمنی حتی کہانی لکھ کر بھی مجھے کھٹکا سا لگا رہتا ہے کہ اسی میں پورا ناول اتر آیا ہے۔

” (جو گنبد پال: تخلیقی اختصار یا بنامہ تخلیقی، اپریل 2008ء ص 7-8)

جو گنبد پال کے افسانوں کے مجموعے ’سلوٹس‘ میں غریبوں اور ان پر ہو رہے استحصال کا پردہ جان ایک بڑی پرانی ’گوچ‘، ’بھوکا‘، ’بوجھ‘۔ افسانیت کا، ’بوجھ‘، ’علم کا‘، ’بھولے بھالے‘، ’انتظار‘، ’تفریح‘، ’سب کے لیے‘ وغیرہ افسانوں میں ملتا ہے۔ ان کے کئی افسانوں میں افریقی زندگی کے نقش ملتے ہیں۔ مثلاً ’بار بار‘ (کرکچن نوآباد کاروں کا قلم و قلم)؛ ایک

جبئی، 'سزا' (نسلی امتیاز)، ایک رنگی (نسلی تفریق) وغیرہ۔ 'گمشدہ'؛ خط استوا اور ایک جبئی میں بھی ایسے ہی موضوعات اجاگر کیے گئے ہیں۔ افسانچہ سمجھ بوجھ میں خدا کی نافرمانی کے خلاف ایک غریب سیاہ فام افریقی ایک پادری کے سامنے یوں احتجاج کرتا ہے:

"میرا خیال ہے کہ خدا ہماری کالی کلوٹی ماں سے رنجہ کیا، اسی لیے آپ کی سفید ماں سے دوسری شادی کرنی اور آپ کے پیدا ہوتے ہی ہماری زمین اور پٹو آپ کے نام لکھ دیے۔" (سمجھ بوجھ)

مذکورہ مجموعے میں انسانی رشتوں پر کئی افسانچے رقم کیے گئے ہیں جیسے 'کلوٹی'؛ افسانچہ 47، 'اس کے بعد' (بکٹی تھکتیں)؛ نیم وا، اجنبی (ازدواجی ان میل)، 'کمپیوٹر عشق' (کمپیوٹر سے جوڑیاں ملے کرنا)؛ 'ٹو نے پو نے لوگ' وغیرہ۔ سولیس؛ میں کئی افسانوں میں چاند اور مریخ کا حوالہ دیتا ہے کیونکہ ان کی تصویر پر امریکہ و روس نے کمر باندھ رکھا تھا۔ مثلاً 'کہاں'۔ ان میں سے بہت سوں پر عنوان درج نہیں ہے۔ افسانچہ نگار جہاں انسان کی ترقی پر غاڑاں ہے وہیں اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ زمین پر غربت اور بیماریاں پکھیلی جارہی ہیں مگر اس طرف کوئی دھیان نہیں دے رہا ہے۔ علاوہ انہیں وہ امریکہ اور روس کی رسد کشی [سرد جنگ] (افسانچہ 54) اور دنیا میں امن بحال کرنے میں اقوام متحدہ کی ناکامی (کنگ ڈم آف داورلڈ) کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں۔ دراصل افسانچہ نگار نے 'خلا' اور 'اڈان' کو علامتیں بنایا ہے اور اکثر انسانی وجود کی حقیقت کو سمجھنے کی کوشش اپنے افسانچوں کے ذریعے کی ہے۔ مثال کے طور پر افسانچے اوراکی (میں ہوں تبھی تو دنیا ہے Cogito ergo sum) ، جزیں (بیگانگی)، نہیں (احساس وجود)، ہالو جی ناٹم (احلاف وجود)، ابدیت، شناخت (شیطان سے واسطہ) وغیرہ۔ عشق و محبت کے حوالے سے بھی کچھ افسانچے ہیں جیسے 'ہتا' (محبت ہمیشہ جواں رہتی ہے)، ہموہ مایا (شباب اور بے بااوت)، 'نوشی' (مجموعی ناموس کا اظہار) 'من ہی من میں' (پتی ورتا تھی کے غم سے)، مانپا اہتا (غما کھٹھ)، 'سیارے' (بیگانگی)۔ اسی

طرح ان کے کئی افسانچے ادب فن اور تکنیک پر مرکوز ہیں جیسے "فن اور حقیقت"، "کائناتیں"، خالق (مخلیق کار کی کسمپرسی)، "فن افسانہ"، میراث نام (انسان کی تخلیقی قوت)، "تجربہ"، ریاضت (کردار کی ایک بچے سے مشابہت)، "معاصرین"، الفاظ (بوصفی لغت اور سکڑتا اظہار)، "نقاد" (تحقیقی معروضیت)، "تصنیف" (بڑے اور چھوٹے قلم کار میں فرق) وغیرہ۔

افسانچے کے مستقبل کے بارے میں جو گندر پال فرماتے ہیں کہ:

"میرے خیال میں افسانچے کی اہمیت بڑھتی ہی چلی جائے گی اور یہ بھی کہ ادب میں خاموشیوں اور وقفوں کی بدولت قارئین کو اس میں تحقیقی طور پر شامل ہونے کی زیادہ گنجائش فراہم ہو جاتی ہے۔ اس سیاق میں یہ ہو سکتا ہے کہ چند سطر کی کہانی ان کے ذہن میں آپ ہی آپ ان کے آگے پیچھے میں بھی کھینچ آئے اور جسے وہ اپنی طور پر ایک کتاب میں پھیلا لے۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ صرف وہی اہم نہیں جو فن کار لکھ دیتا ہے مابقی تو فن کار کی تحریروں میں ان لکھا زیادہ اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔"

(اردو زبان و ادب کا حال و مستقبل پر جو گندر پال سے مکالمہ: ارتضیٰ

کریم: اردو دنیا، فروری 2000ء، ص 55)

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو جو گندر پال کی تحقیقی کائنات بہت وسیع ہے۔ انھوں نے اپنے افسانوں، افسانچوں اور ناولوں میں انسانی زندگی کی گونا گوں تصویریں دقیقہ شناسی سے پیش کی ہیں۔ اس کے علاوہ اردو کو ایک نیا اسٹائل اور ڈکشن دے دیا۔ اردو مختصر افسانے میں ان کی خدمات کو کبھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ افسانچہ ان سے بہت پہلے عالم وجود میں آچکی تھی تاہم اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس صنف کو استحکام بخشنے کا کام جو گندر پال ہی نے کیا۔

ڈاکٹر حنا آفریں

تنویر احمد علوی کی غالب شناسی

غالب کو اس دنیا سے گزرے ہوئے ایک صدی سے زیادہ عرصہ ہو چکا ہے لیکن زندگی اور کائنات سے متعلق ان کے افکار اور نظریات کی تعلیم کا سلسلہ هنوز جاری ہے۔ ہر عہد میں کبھی انھیں ان کی شاعری کے حوالے سے سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے اور کبھی نثری کارناموں کی روشنی میں ان کی تعلیم کا سلسلہ شروع کیا گیا، اسی سلسلے کی ایک کڑی ان کے خطوط ہیں۔ ان خطوط سے غالب کے ادبی اور سوانحی گوشوں کی تلاش مختلف ادبا اور محققین نے اپنے طور پر کی ہے۔ کبھی ان کے خطوط سے اس عہد کے سیاسی، سماجی اور معاشرتی حالات نیز مسائل و معاملات کی گتیاں سلجھائی گئیں، کبھی ان کے ادبی اور شعری اسالیب اور نظریات کو منظر عام پر لایا گیا، کبھی ان کی فنی زندگی میں جھانکنے کی کوشش کی گئی اور کبھی اپنے احباب و متعلقین کے ساتھ ان کے رویوں کو جانچنے، پرکھنے کی سعی کی گئی۔ میرے پیش نظر باہر غالبیات ڈاکٹر تنویر احمد علوی کی مشہور و معروف کتاب "خطوط غالب کی روشنی میں غالب کی سوانح عمری" ہے جس میں انھوں نے غالب کی زندگی کے مختلف گوشوں کو خطوط کی مدد سے اجاگر کیا ہے۔ میں نے یہ کوشش کی ہے کہ تنویر احمد نے جن جگہوں سے خطوط کی روشنی میں غالب کی سوانح کو مرتب کیا ہے، ان کی تعلیم کر سکوں۔

اس کتاب کی ترتیب میں تنویر احمد علوی نے ۳۳ عنوانات کے تحت خطوط کے حوالے سے غالب کی پیدائش، تربیت، شادی، ان کے آباؤ اجداد کا ہندوستان میں ورود، غالب کے عادات و اطوار، ان کی معاشی حالت، اس عہد کے سیاسی، سماجی اور تاریخی حالات وغیرہ معلومات فراہم کر کے ایک مکمل سوانح مرتب کی ہے۔

تویر احمد علوی نے جس طرح غالب کے اسرار کا ذکر خطوط کے حوالے سے کیا ہے اس سے غالب کی ذہنی کیفیت اور معاشی حالت کے متعلق معلومات ملتی ہے۔ غالب نے بھرت پور اور فیروز پور جہم کر کا سفر نواب احمد بخش خاں سے بخش کے سلسلے میں بات کرنے کے لیے کیا تھا۔ غالب کا یہ خیال تھا کہ نواب صاحب نے خولہ حاجی کو ان کے چچا نصر اللہ بیک کے وارثوں میں شامل کر کے ان کے ساتھ نا انصافی کی ہے۔ دو قلیطے کے طور پر ملنے والی بڑی رقم سے وہ اور ان کے اعزہ محروم ہو گئے تھے۔ لہذا اس بات کے احتجاج کی غرض سے غالب نواب صاحب سے ملنے بھرت پور اور فیروز پور جہم کر گئے۔ مرزا علی بخش بہادر کے نام لکھے خط سے غالب کی ذہنی کیفیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے:

”میں فیروز پور جہم کر اس لیے نہیں آیا تھا کہ پھر پانچویں بے نیل مرام واپس ہو جاؤں، نواب صاحب نے بہت ظلم تسلیاں دیں اور وہ انداز ستم روا رکھا جو بظاہر انصاف معلوم ہوتا تھا۔ اس سلوک نے مجھے گمراہ کیا۔ اب اس پر کہاں تک صبر کروں اور اس ناہوت میں قہمی دقتی پر کس طرح چپ بیٹھا رہوں۔“ (اوراق معانی مشمولہ خطوط غالب کی روشنی میں غالب کی سوانح عمری از ڈاکٹر تنویر احمد علوی، ص ۳۷)

تنویر احمد علوی کے خیال میں غالب پریشان ضرور تھے مگر نواب صاحب سے پارے طور پر واپس نہیں تھے وہ نواب صاحب سے کچھ خوش آئند توقعات رکھتے تھے اور امید و جہم کے دوا ہے پر کھڑے تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ مرزا علی بخش بہادر، نواب صاحب سے ان کے لیے کھد خیر کہیں تاکہ ان کی پریشانی دور ہو سکے۔ اس سے غالب کی ذہنی حالت اور ان کی نفسیات کو کھنڈے میں مدد ملتی ہے۔ تنویر احمد علوی نے مولوی فضل حق خیر آبادی، رائے جہم مل کو لکھے خطوط اور مرزا علی بخش بہادر کے ذریعہ غالب کی کتاب ”پنج آہنگ“ میں لکھے دیباچے سے جو حوالے بخش کیے ہیں ان سے غالب کی ذہنی الجھن کے ساتھ ان کی معاشی حالت کا بھی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ غالب اس وقت

اسنے پریشان تھے کہ رائے بیچ مل کو لکھے خط میں موت کی بھی آرزو کرنے لگے تھے۔

نواب صاحب سے مایوس ہو کر غالب نے فیروز پور جہڑکہ سے واپسی کا سفر کیا مگر قرض خواہوں اور حالات کی ناسازگاری کی وجہ سے دہلی نہ جا کر کانپور گئے اور وہاں بیمار بھی ہو گئے۔ جس کی معلومات نامہ ہائے فارسی غالب کی مہارت سے ملتی ہے۔ جس کا ترجمہ تو میر احمد علوی نے اس طرح کیا ہے:

’نواب احمد بخش خاں کے وعدہ کی امید پر فیروز پور کے سفر میں بے طرح پریشان
دوسرے گشت ہوتا قرض خواہوں کے شور و غوغا اور وہاں پہنچ کر بے آمدی کے خطرہ
سے خوف زدگی کے باعث دہلی نہ جاسکتا، سیدھے کانپور پہنچنا اور راہ سفر میں بیمار
ہو جانا، (اس کا سبب بنا)۔‘ (خطوط غالب کی روشنی میں غالب کی سوانح
عمری، ص ۴۳)

تو میر احمد علوی کے خیال میں غالب کا بیان ازروئے قیاس اور مصنعت صحیح معلوم ہوتا ہے کہ انہوں
نے قرض خواہوں کے تقاضے اور اسرار کرنے والوں کی دادرگیر سے بچنے کے لیے کانپور کا سفر کیا۔ غالب
نے کانپور میں کتنے دن قیام کیا اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ اگرچہ کانپور کے بعد لکھنؤ میں ان کے قیام کی
مدت پانچ ماہ اور کچھ دن ہے۔ لکھنؤ پہنچنے کا ذکر ’بیچ آہنگ‘ میں شامل خطوط میں ملتا ہے۔

لکھنؤ علوم و فنون کا مرکز تھا، وہاں فن کے قدردان موجود تھے۔ خان آرزو، میر،
سورامائتا اور صحفی وغیرہ اہل فن نے لکھنؤ کی مہمان نوازی کے سبب وہاں کا رخ کیا تھا۔ تو میر احمد
علوی کے خیال میں غالب بھی اپنے حالات کی ناسازگاری سے پریشان ہو کر قدرا فزائی کی امید پر
لکھنؤ گئے ہوں گے۔ حالی نے ’یادگار غالب‘ میں جو غالب کے سفر لکھنؤ کا زمانہ بتایا ہے تو میر احمد
نے اس کی تردید کی ہے کہ وہ دور نصیر الدین حیدر کا نہیں تھا اور نہ ہی روشن الدولہ نائب السلطنت
تھے۔ غالب کے لکھنؤ کے زمانہ قیام میں کبھی کسی بھی خط میں ان کا ذکر نہیں ملتا۔ اس وقت سلطنت
اودھ کے فرماں رواں غازی الدین حیدر اور نائب السلطنت آغا میر تھے۔ غالب نے ان کے لیے
ایک قصیدہ لکھا جو نکلیات فارسی غالب جلد دوم میں شامل ہے اور نصیر الدین حیدر سے منسوب کیا

گیا ہے۔ حواشی میں یہ بھی تحریر کیا گیا ہے کہ اسے ابتداً غازی الدین حیدر کے لیے لکھا گیا تھا۔ بعد میں محمود کا نام تبدیل کر دیا گیا۔ مولوی سبحان علی کے نام لکھے گئے خط کے ترجمے سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ غالب نے یہ قصیدہ کیوں لکھا:

”اس دور آشفتگی میں لڑماں دوائے اودھ کے آستانے کے سوائے میں نے کسی اور کی چوکت پر سر نہیں جھنایا۔۔۔ اور اس جتنو میں خانہ رفیع الشان کی طرف رجوع کرنے کے سوا کسی اور کا احسان نہیں لیا۔۔۔“

کہ یہ عرض داشت شرفیاب اودھ کے آصف جانی کی نگاہ قبول سے فروغ پائے اور یہ قصیدہ شاہ اودھ کی بزم بہشت آئین میں پڑھا جائے تاکہ مجھے سخن رخ و ستائش لکھ ہوں۔ انعام ضروری سے امتیاز حاصل ہو اور یہ صلہ بھی اُس گراں مائی کے ساتھ عطا ہو کہ یہ مری نام آوری کا سبب بنے اور خود اپنی نگاہ میں بھی مجھے سر بلند کر دے۔“ (ادراق معانی مشورہ خطوط غالب کی روشنی میں غالب کی سوانح مری ص ۵۰)

اس تحریر سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ غالب دربار اودھ سے اس کے شایان شان صلہ کے خواہش مند تھے۔ مولوی سبحان علی خاں نے ان کی اس عرض داشت کو کسی وسیلے سے آگے بھی پہنچا دیا مگر غالب کو دربار کی سعادت و مسرت میسر نہ ہوئی۔ اس کو ہر مقصود کے لیے غالب نے سبحان علی خاں کے ملاوہ مولوی کرم حسین خاں (سفیر شاہ اودھ) اور مولوی امداد حسین خان بہادر کے نام بھی خط لکھے جس میں دربار اودھ تک رسائی کی خواہش ظاہر کی گئی تھی۔ لکھنؤ کے امرا کے نام لکھے خطوط سے غالب کے لکھنؤ آنے کی وجہ متعین ہو جاتی ہے کہ انھیں زاوہ راہ کی طلب اور سفر کے حصول کی خواہش کس طرح لکھنؤ کے امرا کے قریب لے گئی۔ غور احمد علوی نے ان تمام اصحاب کے خطوط کی روشنی میں یہ ثابت کیا ہے کہ شدید خواہش کے باوجود غالب کو دربار اودھ تک رسائی میسر نہیں ہوئی تھی۔ وہ بے ٹیل مرام لکھنؤ سے واپس چلے گئے تھے۔ ان خطوط کے حوالے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دربار اودھ تک رسائی کتنا مشکل تھا۔ غالب اپنے شایان شان خیر مقدم کے خواہش مند

تھے مگر وہاں ایسا کچھ نہ ہوا۔ نکھنوں کا سفر غالب کی امیدوں کا مرکز ضرور تھا مگر سلسلہ سفر کا باب نہیں تھا۔ لہذا غالب نکھنوں سے کانپور ہوتے ہوئے بانڈا پہنچ گئے۔ رائے پنچم مل کو بانڈا کے سفر کے متعلق لکھتے ہیں:

’وہی قصہ کہ ۲۵ تاریخ کو میں جمعہ کے دن اس ستم آباد سے باہر نکلا اور ۲۹ تاریخ کو دارا سرور کا پتھر پہنچا۔ دو تین مقامات سے ہوتا ہوا پانڈا فر بانڈا پہنچ چاہاں گا اور وہاں چند روز آرام کر کے اگر خدا نے چاہا اور مرگ نے مان دی تو عازم کلکتہ ہو چاہاں گا۔ (اوراق معانی مشمولہ خطوط غالب کی روشنی میں غالب کی سوانح عمری، ص ۷۷)

اس اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان تمام اسفار کا مقصد کلکتہ پہنچنا تھا۔ غالب نے نواب احمد بخش خاں صاحب کی طفل تیلیوں کے سبب یہ عہد کر لیا تھا کہ اب وہ اپنی عرضی انگریز حکام کے نزدیک پیش کریں گے تاکہ ان کی پنشن کا مسئلہ حل ہو سکے۔

رائے صاحب رام پور اور مولوی محمد علی خاں صدر امین بانڈا کے نام تحریر کردہ خط سے نہ صرف ان کی حالت دریافت ہوتی ہے بلکہ سفر کے دوران پیش آنے والی دشواریوں سے بھی واقفیت ہوتی ہے کہ اس وقت جیل گاڑی اور چمکڑکتے ست روی سے چلتے تھے اور اس کے کیا اسباب تھے۔ پھر غالب نے الہ آباد تک کا سفر تیل گاڑی کے بجائے کشتی سے کیا۔

’لوگا اور جمنائے عظم پر آباد الہ آباد شہر غالب کو پسند نہیں آیا۔ وہ جس مکان میں ٹھہرے تھے وہاں سہلوں کا بھی فقدان تھا۔ غالب نے الہ آباد کی شہری فضا اور غیر صحت افزا ماحول کے متعلق کافی کچھ لکھا۔ کچھ دنوں بعد غالب بذریعہ کشتی بنارس پہنچے۔ یہ شہر الہ آباد کی بہ نسبت انھیں پسند آیا جس کی تعریف میں غالب نے خوب لکھا۔ ان کے اس تعلق خاطر کا اندازہ مثنوی ’چراغ دہرے سے لگایا جاسکتا ہے جس میں انھوں نے صنم پرستوں کے اس شہر کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ بنارس شہر کے متعلق نامہ ہائے قادری غالب‘ میں لکھتے ہیں:

’فرشتے اس کی خوشبو کو اپنے ثنائوں پر لے کر فضاے قدس میں پرواز کرتے ہیں اور اس کا سراپا اہل عشق و عقیدت کے تئیں نکھار دیا، جمال ہے بنارس کے لیے کوئی

کہتا ہے کہ یہ نگار نہ تکتا ہے۔ میں اسے نہجِ عقلیٰ جتے ہوں اور دریا رنگ کی لہریں
اس کی خوشامی ہو نہ ہی ہوئی فکٹیں ہیں، اس کے چکر وجود کی طرف طرفہ دل آویز ہیں
کی جہ سے دہلی جیسے شاعری شہر اس کو دعا درد سے یاد کرتا ہے۔ (عامہ ہائے فاضلی
غالب مشمولہ خطوط غالب کی روشنی میں غالب کی سوانح عمری، ص ۶۳)

تنویر احمد علوی نے مثنوی 'چراغِ دیہ' اور خط سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ بنارس کا سفر غالب کے لیے
نہایت دل فکٹیں اور خوبصورت تجربہ رہا۔ اس شہر میں غالب کو جو ذہنی راحت اور روحانی مسرت
نصیب ہوئی اس کی جہ سے گزرے اسفار کی تھکان اور کمزورت دور ہو گئی کیوں کہ لکھنؤ وہ جس امید
میں گئے تھے وہ پوری نہیں ہوئی تھی مگر اس شہر کی دل آویز فضا سے انھیں چلتی اور جسمانی سکون میسر
ہوا۔ اس لیے غالب اس شہر میں ایک ماہ ٹھہرے۔

بنارس سے عظیم آباد تک کا سفر غالب نے گھوڑے سے کیا پھر مرشد آباد گئے مگر ان دونوں
شہروں میں انھوں نے کہیں قیام نہیں کیا۔ بالآخر غالب اپنی منزل مقصود کلکتہ ۲۷ فروری ۱۸۴۷ء کو
پہنچ گئے جہاں سمجھتی بہادر کے سامنے انھیں اپنی عرضی پیش کرنا تھی۔ یہ شہر جو انگریز قوم کا مرکز
حکومت تھا اپنی فضا اور آب و ہوا کے اعتبار سے انھیں پسند آیا۔ رہائش کے لیے جو مکان کرایے پر
لیا وہ بھی اطمینان بخش تھا۔ علی بخش خاں اور مولوی محمد علی خاں کو لکھے خطوط میں اس شہر اور مکان کی
کشادگی کا ذکر ملتا ہے۔ کلکتہ پہنچنے سے قبل انھیں نواب احمد بخش خاں کے انتقال کی خبر فضل مولوی
خاں کے ذریعہ مل چکی تھی۔ غالب کے خیال میں نواب احمد بخش نے ان کے ساتھ زیادتی کی تھی
اس کے باوجود کلکتہ پہنچنے کے بعد غالب نے علی بخش بہادر کو تعزیتی خط لکھا جس کا ترجمہ تنویر احمد
علوی نے اپنی کتاب 'اوراقِ معانی' میں شامل کیا ہے۔

کلکتہ پہنچنے کے بعد غالب فکر مند ہوئے کہ کس طرح وہ ان انگریز حکام سے ملاقات کریں جو
ان کے مقدمے کی کارروائی میں مددگار ثابت ہو سکیں۔ اس کے لیے وہ سب سے پہلے مسز اندر و اسٹر
ٹک سے ملے۔ پہلی ملاقات میں ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے اور ہر ملاقات میں یہ ہاتھ

مزید بڑھتا رہا۔ غالب نے ان کی ذاتی اور افسرانہ خوبیوں سے متاثر ہو کر فارسی زبان میں ایک قصیدہ بھی لکھا۔ انگریزی دستور کے مطابق غالب کی درخواست مسز پائن کے سپرد ہوئی جو انھیں فارسی سے انگریزی زبان میں ترجمہ کر کے مسز فریز کی خدمت میں پیش کرتے تھے۔ فریز صاحب اصل و نقل کا مقابلہ کر کے اسے صاحبان کاؤنسل کی عرض گاہ میں پہنچانے کا کام کرتے تھے۔

نور احمد علوی نے کلکتہ کے زمانہ قیام کے جن خطوط کا انتخاب اپنی کتاب میں پیش کیا ہے ان سے غالب کی ذاتی حالت کا اندازہ ہوتا ہے۔ رائے جھنجھل کو لکھتے ہیں:

”آپ سے یہ اتنا اس ہے کہ تھوڑی سی زحمت برداشت کریں۔ کچھ بھی وقت ضائع نہ فرمائیں اور فخر الدولہ بہادر کی سرکار کے حالات، جو ان کے ساتھ وفات کے بعد آجرا پذیر ہوئے ہوں، وہ دیکھ لیں کہ کبھی ان کی حالت میں حشو زمانہ سے بھی صرف نظر نہ کریں جو کچھ معلوم ہوا اور جو بنوڑ معلوم نہ ہوا، اسے معلوم کرنے کی سعی کریں۔“
(ادبیاتی معانی مشورۂ خطوط غالب کی روشنی میں غالب کی سوانح عمری، ص ۸۸)

اس خط سے نور احمد علوی نے یہ نتیجہ نکالا کہ غالب کی پیشین کا تعلق اسی جاگیر سے تھا۔ لہذا وہ جاگیر فیروز پور جھمکر پر گہری نظر رکھتے اور وہاں ہو رہی سرگرمیوں سے واقف ہونا چاہتے تھے۔ چونکہ غالب کے مقدمے کی پیشین کش کا رخ کلکتہ سے دہلی کی جانب ہو گیا تھا اس لیے اب وہ زیادہ مضطرب اور پریشان رہنے لگے اور دہلی رہنے پڑنے کی نیکی کا حال جاننے کے لیے غور مند رہنے لگے۔ اس کے لیے انھوں نے اپنے مخلص دوست رائے جھنجھل کی مدد لی۔ ان ناسازگار حالات میں بھی غالب ادبی موضوعات کے لیے وقت نکالتے رہے۔ اس دوران انھوں نے جو قصائد لکھے ان میں حالات کی ناسازگاری اور ناسامدیت زمانہ کی شکایت کی۔ کلکتہ میں قیام کے دوران غالب نے جن ادبی انجمنوں اور مشاعروں میں شرکت کی ان کا بھی ذکر ملتا ہے کہ یہ طرہی مشاعرے سرگرمی آمیزوں کا سبب بن گئے۔

کافی دن پریشانی میں مبتلا رہنے کے بعد غالب کو حاکم دہلی کی رپورٹ کی نقل اور اس پر تحریر

ضمیر کی قلقلیں دستیاب ہو گئیں۔ غالب نے جو موقع گورنر جنرل سے کی تھی کہ وہ حاکم سے اپنے حق میں فیصلہ کروالیں گے، ایسا نہیں ہوا۔ غالب کی حالت خطرہ ختم نہیں ہوئی۔ تین سال تکلت میں رہنے کے بعد غالب جب نامراد واپس ہوئے تو بہت دلی کوفت اور ذہنی آزار میں مبتلا تھے کہ کیا ہو اور کیسے ہو؟ ان کے کچھ دوستوں نے دہلی کو خیر باد کہہ دیا، کچھ نے اس دنیا کو۔ مولوی فضل حق خیر آبادی جس وقت دہلی سے باہر تھے ان کے گھر میں آگ لگ گئی۔ اس ہولناک حادثے کی خبر سن کر غالب بے تاب ہو گئے اور خیر و عافیت کے لیے ان کے متعلقین کو خطوط لکھے۔

تکلت میں رہتے ہوئے غالب جس طرح دہلی اور اس شہر سے متعلق لوگوں کے لیے فکر مند رہتے تھے، دہلی پہنچنے کے بعد تکلت کی فکر میں مبتلا رہنے لگے اور وہاں موجود دوستوں کی خیریت خط لکھ کر دریافت کرتے رہے۔ عوید احمد علوی نے اس طرح کے جتنے بھی خطوط کتاب میں شامل کیے ہیں ان سے احباب کے لیے غالب کی ہمدردی اور غلوں کا ہر ہوتا ہے۔ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ خاصانہ تعلقات قائم رکھتے تھے۔ تکلت کے دوستوں میں مولوی سراج الدین احمد کا نام لیا جا سکتا ہے جنہیں غالب نے زیادہ خطوط لکھے ہیں۔ غالب نے نہ صرف اپنے دوستوں سے مقدمے کے تعلق سے گفتگو کی ہے بلکہ ان کے غم میں بھی شریک رہے۔ تکلت میں وہاں کا آنا اور غالب کا فکر مند ہونا پھر مولوی سراج الدین احمد کی خواہر عزیز کے انتقال کی خبر پر اظہارِ افسوس، ان سب باتوں سے غالب کی ہمدردی اور محبت ظاہر ہوتی ہے۔

مسٹر اسٹرلنگ جو تکلت کے مرکزی دفتر میں ایک اہم عہدے پر فائز تھے، ان کے انتقال کی خبر نے بھی غالب کو کبیدہ خاطر کیا۔ تو عوید احمد علوی نے غالب کے جو خطوط منتخب کیے ان سے اندازہ ہوتا کہ غالب ان پر اتنا بھروسہ کرتے تھے کہ ریڈینٹ دہلی جو بھی رپورٹ بھیجیں، مسٹر اسٹرلنگ ان کے حق میں فیصلہ کر دلائیں گے۔ اسی دوران کرل ہنری الماک کا بھی انتقال ہو گیا، وہ بھی غالب کے ہی خواہوں میں تھے۔ غالب ریڈینٹ دہلی کے روپے سے مطمئن نہیں تھے۔ اس لیے انہوں نے کرل ہنری الماک سے یہ درخواست کی کہ وہ ریڈینٹ بہادر کو ان کے لیے سلامتی خط لکھیں۔ ان خطوط کے

حوالے سے غالب کی معاشی حالت، ان کی شدید غواہش اور ذاتی کوشش پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

غالب اس امید میں تھے کہ گورنر جنرل دہلی آئیں گے اور ان کے ساتھ ہونے والی حق تلفیوں کے خلاف اپنا فیصلہ سنائیں گے مگر ایسا نہیں ہوا۔ گورنر جنرل نے نکلتے میں ہی رہتے ہوئے غالب کے خلاف فیصلہ سنادیا۔ غالب کو اس مقدمے میں شکست ہوئی اس کا ذکر بار بار دوستوں کو لکھے خطوط میں ملتا ہے۔ غالب ابھی اس الجھن میں گرفتار ہی تھے کہ ایک دوسری خبر نے انھیں پریشان کر دیا۔ نواب احمد علی خاں کے والی ریاست نواب شمس الدین احمد خاں نے ذاتی اختلاف کے تحت ولیم فریزر کا قتل کر دیا۔ سرکار کے حکم سے والی فیروز پور ججر کو مجرم قرار دے کر گرفتار کر لیا گیا۔ ان کی گرفتاری کا الزام غالب کے سر آیا کہ انھوں نے انگریز حکام سے ان کے متعلق تجویز کی ہے۔ عویر احمد علوی نے شیخ امام بخش ہارنج کو لکھا غالب کا جو خط نقل کیا ہے اس کی روشنی میں یہ بات سامنے آتی ہے کہ اس وقت دہلی میں غالب کے لیے کس طرح کی افواہیں گرم تھیں۔ اس قسم کی افواہ گویوں نے غالب کو اور بھی مضطرب کر دیا۔ نواب شمس الدین کو پھانسی دے دی گئی اور ان کی جاگیر فیروز پور کو سرکار نے ضبط کر لیا۔ اب غالب کے نزدیک پریشانی یہ تھی کہ انگریز حکام ان کے ساتھ کس طرح کا سلوک روا رکھتے ہیں کیوں کہ جو تکلیف انھیں جاگیر فیروز پور سے ملتا تھا وہ کم تھا۔ انھیں اس سے زیادہ رقم ملنی چاہیے مگر یہاں مایوسی ہاتھ لگی۔ عویر احمد نے گورنر جنرل کی آمد سے متعلق غالب کے کئی خطوط کتاب میں شامل کیے ہیں۔

غالب نے قاضی محمد صادق (اختر جو ناگدھی) کے لیے جو اشیاء منتخب کر کے بذریعہ خط بھیجے ساتھ میں اس میں اپنے خاندان کے متعلق معلومات بھی فراہم کی، لکھتے ہیں:

’میں ترک خواہوں اور میرا نسب نامہ افراسیاب اوزوشم سے جا کر مل جاتا ہے۔ میرے اجداد اس وجہ سے کہ سلقوں کے ساتھ رہو، ہم گوہری رکھتے تھے ان کے دور میں انھوں نے سپہ گری و کشور کشائی کا پرچم بلند رکھا۔۔۔ میرے اجداد کی آراء میں گاہ توہان کا شہر سرقد تھا۔ ان لوگوں میں سے میرا دادا اپنے باپ سے ناخوش ہو کر غلام

ہندوستان ہوا اور لاہور میں نواب مصحین الملک عرف مرزا منوکی بھراہی اختیار کی۔ جب مصحین الملک کی بساط بھی وقت نے الٹ دی تو میرے جد بزرگوار نے دہلی کا رخ کیا اور ذوالفقار الدولہ مرزا نجف خاں سے رسم و رادہ پیدا کی۔ اس کے بعد شاہجہاں آباد میں میرا باپ عہد اللہ بیگ خاں عالم وجود میں آیا۔ میری پیدائش اکبر آباد میں ہوئی۔ میری عمر پانچ سال کی ہوئی کہ شفیق باپ کا سایہ میرے سر سے اٹھ گیا۔ میرے چچا نصر اللہ بیگ خاں نے چاہا کہ ہزار و فہم کے ساتھ میری پرورش کرے تو اسے اہل نے امان نہ دی۔ (لاخطوط غالب کی روشنی میں غالب کی سوانح عمری، ص ۱۳۸)

اس خط سے غالب کے آپاد اجداد، ترک وطن، پیدائش اور بچپن کے حالات پر خاطر خواہ روشنی پڑتی ہے۔ بخیر احمد علوی نے ایسے خطوط کی تلاش و تحقیق اور شمولیت سے غالب کے سوانحی نقوش کو مستند طور پر پیش کیا ہے۔

غالب اپنے دوستوں سے بہت محبت کرتے تھے۔ ان کے ساتھ مروت اور ہمدردی کا رویہ اختیار کرتے تھے۔ ایک بار نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ نے اپنا مشہور تذکرہ نگار اشاعت سے پہلے نظر ثانی کے لیے غالب کے پاس بھیجا۔ غالب نے تعریف کے بعد اس کی تقریظ لکھنے کے ساتھ یہ بات بھی لکھی کہ اس میں ان کے دوست مرزا احمد بیگ کو شامل کر لیا جائے۔ اس طرح اپنے مرحوم دوست کے لیے غالب نے حق دوستی بھی ادا کیا۔ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ غالب کے قریب ترین دوستوں میں شمار کیے جاتے تھے ان کو لکھے ایک خط سے غالب کے پسندیدہ چلن آم کے متعلق معلومات ملتی ہے۔ بخیر احمد علوی نے غالب کے جو بھی خطوط لکھا کیے ہیں، ان سے غالب کی زندگی کے کسی نہ کسی گوشے پر روشنی ضرور پڑتی ہے اور قارئین غالب کے احوال و کوائف سے واقف ہوتے چلے جاتے ہیں۔

کتاب میں شامل مصطفیٰ خاں شیفتہ کو لکھے غالب کے خط سے دہلی میں ہونے والے مشاعروں

اور خاص طور سے لال قلعے کے مشاعروں کی تصویر آنکھوں کے سامنے آ جاتی ہے۔ غالب کو ریختہ گوئی سے دلچسپی نہیں تھی مگر قلعے کے تعلق سے بادشاہ کی فرمائش پر اردو اشعار مشاعروں میں سناتے تھے۔ اس زمانے کی شعری محفلوں میں پیش کی جانے والی تخلیقات سے ان کے رنگ و آہنگ کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ ایک مشاعرے کا ذکر غشی نبی بخش حقیر کو تحریر کردہ خط میں اس طرح کرتے ہیں:

’کل تیموری شہزادوں میں سے ایک نے اپنے یہاں بزم سخن آراستہ کی اور اہل سخن کو دعوت غزل غزلیں دی، مجھے ریختہ گوئی سے کوئی واسطہ نہیں رہا، اس باب میں بہت ترڈو تھا کہ جاؤں یا نہ جاؤں، معذرت کیوں کر کروں، جب اس بزم میں جا رہا تھا۔ خاص طور پر اس وقت جب میں ہولدار میں سوار ہو کر راستہ طے کر رہا تھا چند شعر بے ارادہ اس فہم زدہ اور خون شدہ دل سے ٹپک پڑے۔ تمہیں بھیج رہا ہوں اور چاہتا ہوں کہ تم اس زمین سخن میں خود غزل کہہ کر مجھے بھیج دو۔‘ (اوراق

• معانی مشلولہ خطوط غالب کی روشنی میں غالب کی سوانح عمری ص ۱۶۰)

غالب کی اس طرح کی تحریروں سے ان کے ادبی مشغلوں کا پتہ چلتا ہے اور یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ اپنی تمام پریشانیوں اور محرومیوں کے باوجود غالب شعر و ادب سے کس طرح وابستگی پر وابستہ تھے۔ ان کا یہ مشغلہ اس حد تک تھا کہ دوستوں کی تحریروں کی ٹوک پٹک تک سنوارا کرتے تھے۔ انگریز حاکم میجر جان جاکوب کی فرمائش پر ان کے مکان کا قطعہ تاریخ لکھ کر یہ ذریعہ خط بھیجا۔ اس کے علاوہ مسٹر جیمس طاسن کے لیے ایک غزل لکھی جس میں مطلع میں بطور قافیہ ان کے نام کا استعمال کیا۔ اس طرح غالب کے خطوط سے ان کے سوانحی کوائف کے ساتھ ساتھ ادبی رویے پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

تخویر احمد علوی نے ’دلی کا لُج کی ملازمت‘ عنوان کے تحت ’یادگار غالب‘ کا جو واقعہ نقل کیا ہے اس کی روشنی میں وہ اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی شخص اتنا پریشان اور قرض دار ہو مگر وہ بارگورنری میں استقبال نہ ہونے کی بنا پر کالُج کی ملازمت نام منظور کر دے، یہ بات قرعہ

قیاس معلوم نہیں ہوتی۔ غلام رسول مہر اور مالک رام نے بھی غالب کی سوانح عمری میں اس طرح کے کسی واقعے کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے۔

غالب کے واقعہ اسیری کے متعلق حالی نے 'یادگار غالب' میں جس طرح کی صورت حال پیش کی اور اس واقعے کی پردہ داری کی ہے، تو خیر احمد اس کی تردید کرتے ہیں کہ غالب نے واقعہ اسیری سے متعلق زنداں نامہ تحریر کیا، اس میں ان کی قید و بند کی صعوبتوں کا ذکر ملتا ہے کہ انھیں وہاں کسی سے ملنے کی اجازت نہیں تھی۔ غالب کا یہ واقعہ ۱۸۴۷ء کا ہے۔ غالب کو چوسر اور شطرنج کا بہت شوق تھا اور وہ اسے کچھ بد کر کھیلتے تھے۔ یہی بات کوثر ال نے ان کے خلاف قمار بازی کا مقدمہ بنا کر مجلسریت کے سامنے پیش کر دی۔ جس کے تحت غالب گرفتار ہوئے اور انھیں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنا پڑیں۔ اردوئے معلیٰ میں شامل نکتہ کے نام ایک خط میں غالب اس واقعے پر اظہارِ افسوس کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

سرکار انگریزی میں بڑا پایہ رکھتا تھا۔ رئیس زادوں میں گنا جاتا تھا۔ پورا خلعت پاتا تھا۔ اب بدنام ہو گیا ہوں اور ایک بہت بڑا لہجہ لگ گیا ہے۔ (خطوط غالب کی روشنی میں غالب کی سوانح عمری ص ۱۸۵)

غالب کے یہ تاثرات اسی بات کی جانب اشارہ کرتے ہیں جن کا تعلق غالب کی اسیری سے ہے کیوں کہ ان کی زندگی میں اس کے علاوہ اور کوئی واقعہ رونما نہیں ہوا جس میں غالب کی اتنی رسوائی ہوئی ہو اور ان کے ساتھ ذلت آمیز سلوک کیا گیا ہو۔

غالب کی زندگی میں ان کی بیوی کے بھانجے زمین العابدین خاں عارف کی بڑی اہمیت تھی۔ والد اور پھر تانا کے انتقال کے بعد عارف کی پرورش غالب کے ہی گھر ہوئی۔ تو خیر احمد نے اپنی کتاب میں غالب کی وہ غزل بھی شامل کی ہے جو انھوں نے عارف کے انتقال کے بعد ان پر لکھی تھی جس سے غالب کی عارف سے ولی محبت نمایاں ہوتی ہے۔ غالب، عارف کے کلام کی اصلاح بھی کرتے تھے۔ عارف نے غالب کے ہی رنگ میں اپنا دیوان 'مطلع مہر معاوت' مرتب کیا تھا۔

مظفر حسین خاں اور مولوی سراج الدین کو غالب نے جو خطوط لکھے ان سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنی شعری اور تنزی و دنوں تحریروں کو یکجا کرنا شروع کر دیا تھا۔ ان کا دیا ان ریختہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے سے تقریباً سولہ سترہ برس پہلے شائع ہو چکا تھا۔

۱۸۵۷ء کے تعلق سے غالب نے جو خطوط اپنے دوستوں کو تحریر کیے ان کو ترتیب دینے کے لیے عمیر احمد علوی نے غالب کے خطوط کے مجموعے اردوئے معلیٰ، نمود ہندی اور نظام رسول مہر کی کتاب 'غالب' سے مدد لی ہے۔ ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ غالب کے ساتھ ساتھ اور دوسرے اہل شہر کے لیے بھی پریشانیوں کا باعث بنا۔ بہادر شاہ ظفر کو انگریزوں نے اس لیے معتوب کیا کہ وہ ان کے نزدیک باقی سپاہیوں کے حامی اور ہمدرد تھے۔ اس ہنگامے کے ختم ہونے کے بعد شہر دہلی کو جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اور فتح دہلی کے بعد انگریزوں نے اہل شہر کے ساتھ جو رویہ اختیار کیا اس کی تصویر کشی غالب کے خطوط میں جگہ جگہ موجود ہے۔ نواب امین الدین احمد خاں اور ضیاء الدین احمد خاں کا سب سامان لوٹ لیا گیا۔ ان کے مکان میں سوائے اثاثوں کے کچھ باقی نہ رہا۔ علامہ فضل حق خیر آبادی جو شہر کے ممتاز لوگوں میں شمار ہوتے تھے انھیں گرفتار کر کے سزا کے لیے کالا پانی بھیج دیا گیا۔ مولوی امام بخش صہبائی کو گرفتار کر کے قوہ کے منہ پر باندھ کر آڑا دیا گیا۔ مفتی صدر الدین نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ اور حسین مرزا کے ساتھ بھی بہت برا سلوک کیا گیا۔ میر احمد حسین میکش کو موت کے گھاٹ اتارا گیا۔ مغل شہزادوں کو بھی پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ اس ہنگامے میں غالب نے اپنے چھوٹے بھائی مرزا یوسف کو بھی کھودیا۔ وہ عالم دیوانگی میں گھر سے باہر نکل گئے تو کسی گورے نے انھیں اپنی گولی کا نشانہ بنا دیا۔ قلعے سے تعلق کی بنیاد پر غالب کی پشت ضبط کر لی گئی مگر بعد میں یہ دقت جاری ہوئی۔ اس پشت سے ان کی ایک مستقل آمدنی ہوتی تھی۔ اس سے عمیری غالب کے لیے پریشانی کا سبب تھی جس کا ذکر ان کے خطوط میں ملتا ہے۔ فتح دہلی کے بعد انگریزوں نے جاگیریں بھی ضبط کر لیں، حویلیوں کو نیا نام کر دیا، مکانوں کو ڈھا دیا اور دارو گیر کا سلسلہ کافی عرصے تک جاری رکھا۔ غالب کے خطوط میں ہم اس دور کی تفصیلات تلاش کر سکتے

ہیں۔ جس طرح وہ اپنے خطوط میں شہر کی چابی اور بربادی کا تذکرہ کرتے ہیں اس سے ایک تاریخ مرتب ہو جاتی ہے۔ مثلاً

’بھائی وہ زمانہ آیا کہ سینکڑوں عزیز راہی ملکب عدم ہو گئے۔ سینکڑوں ایسے مفلو داختر ہوئے کہ ان کی مرگ و زیست کی خبر نہیں جو دو چار باقی رہے ہیں خدا جانے کہاں بستے ہیں کہ ہم ان کے دیکھنے کو ترستے ہیں۔‘ (غالب از غلام رسول مشمولہ خطوط غالب کی روشنی میں سوانح عمری، ص ۴۱۲)

غالب کی زندگی کے یہ شب و روز وہ تاریخی حادثات ہیں جو شہر دہلی پر گزرے۔ غالب نے اپنے دوستوں اور عزیزوں کو جو بھی خطوط لکھے ان سے شہر دہلی اور اہل شہر کی چابی و بربادی کی تصویر نظروں کے سامنے آ جاتی ہے۔

نصیر احمد علوی نے غالب کے خطوط کو جس طرح سلسلے وار ترتیب دیا ہے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے کچھ وقت کے بعد غالب نے اپنی کتابوں کی اشاعت میں دلچسپی بھی لینا شروع کر دی تھی اس وقت انھوں نے بیچ آہنگ، مہر نیم روز اور کلیات فارسی کے لیے کوشش شروع کر دی تھی اور دہلی کی اشاعت کے لیے کافی اہتمام بھی کیا تھا۔ میر مہدی بخرواح کو لکھتے ہیں:

’میں نے گیارہویں مئی ۱۸۵۷ء سے اکتیسویں جولائی ۱۸۵۸ء تک کی روداد نمٹ میں ہمارے فارسی نیا میلت بحرانی لکھی اور وہ چندہ سطر کے سطر سے چار جزو کی کتاب ہے۔ آگرہ کے مطبع مفید خلافت میں چھپنے کو گئی ہے۔ ’دہلیو اس کا نام رکھا ہے اور اس میں صرف اپنی سرگزشت اور اپنے مشاہدے کے بیان سے کام رکھا ہے۔‘ (میر مہدی مشمولہ خطوط غالب کی روشنی میں سوانح عمری، ص ۴۳۴)

نصیر احمد علوی کے خیال میں غالب نے ’دہلیو‘ میں جس طرح اپنا سوانح نامہ تحریر کیا اس سے اس وقت کی تاریخ مرتب ہو جاتی ہے۔ صرف ہنگامے کے وقت ہی نہیں بلکہ اس کے بعد بھی غالب کا قلم مسلسل ان حادثات کے متعلق لکھتا رہا۔ غالب شہر دہلی کے سوانح نگار ہی نہیں بلکہ مورخ کی طرح

کام کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کے خطوط اور اس سے متعلق کتاب 'دخترِ اس بات کی شاہد ہیں۔
 کچھ عرصے بعد غالب کی طبیعت خراب رہنے لگی اور انہیں بیمار یوں نے گھیر لیا جس کا اثر ان کی تحریر
 پر بھی پڑا اور وہ اس کا ذکر احباب کو کئی خطوط میں کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر غالب کی یہ تحریر دیکھیے:
 "میں یہ لکھ چکا ہوں کہ نہ مجھے تحریر کی طاقت نہ اصلاح کا ہوش۔ ایک بات کو دس
 دس بار کیا لکھوں، اب میرا انجام کار وہو طرح پر محصور ہے، یا صحت یا مرگ، پہلی
 صورت میں خود اطلاع دوں گا، دوسری صورت میں سب احباب خارج سے سن
 لیں گے۔" (خطوط غالب کی روشنی میں غالب کی سوانح عمری، ص ۴۴۲)

اس خط کی روشنی میں یہ بات سامنے آتی ہے کہ اس عمر میں بھی غالب احباب و متعلقین کے کلام
 پر اصلاح کا کام کرتے رہے۔ اس سے غالب کی خوبیاں ہمدردی، محبت اور اخلاص نمایاں ہوتی
 ہیں۔ ۱۸۵۷ء کے جنگ سے کے بعد غالب بارہ برس اور زندہ رہے اور ۱۸۶۹ء میں ان کا انتقال ہوا۔
 ان تھکیلات سے بہ خوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ تنویر احمد علوی نے خطوط کے متن میں
 نکھرے ہوئے غالب کے سوانحی نقوش اس خوبی اور جانفشانی سے کچھا کر دیے ہیں کہ غالب کی
 زندگی، اس عہد کے سیاسی، معاشی اور ادبی حالات، غالب کے ادبی رویے، عادات و اطوار، فکری
 اور فنی طریقے کار گویا ان کے ظاہر اور باطن کا ایک ایک پہلو روشن ہو گیا ہے۔

تنویر احمد علوی نے نہ صرف غالب کی فارسی کتاب 'بیج آبک' کا اردو ترجمہ 'اوراقِ معانی' کے
 نام سے کیا بلکہ غالب کی فارسی شاعری پر بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اس کے ساتھ ہی غالب
 کے فارسی خطوط اور ان کی دوسری کتابوں کی مدد سے غالب کی سوانح عمری مرتب کی اس سے ان کا
 شمار ماہرِ سخنِ غالبیات میں ہو جاتا ہے۔ جبکہ غالب کے قلم نے خود اپنی سوانح لکھی تھی۔ یہ الگ
 بات ہے کہ خطوط کی شکل میں اس کی کوئی مربوط شکل نہیں تھی جسے تنویر احمد علوی نے سلسلے وار ترتیب
 دے کر ایک مکمل سوانح مرتب کر دی ہے۔



ڈاکٹر شفیع ایوب

غالب شناس: کمال احمد صدیقی

کمال احمد صدیقی کی شخصیت کے کئی پہلو ہیں۔ وہ ایک کامیاب براڈ کاسٹر، ممتاز شاعر، افسانہ نگار، انٹاپروڈاز، ماہر غرض، ناقد اور محقق تھے۔ بیسویں صدی کی چوتھی دہائی میں ان کی نظموں کا خوب شہرہ ہوا۔ اپنی قدامت پرستی کے لئے مشہور نکلنوں میں رہ کر انھوں نے آزاد نظم میں اسے کامیاب تجربے کئے تھے کہ میراجی اور ان۔ م۔ راشد کے ساتھ ان کا نام لیا جانے لگا۔ قیوم نظر، یوسف ظفر، ضیاء جالندھری، محمود جالندھری اور مختار صدیقی جیسے معاصرین کی طرح کمال احمد صدیقی بھی تجربہ پسند تھے۔ ذہنی اور جذباتی طور پر حلقہ ارباب ذوق کے قریب تھے۔ ان کی آزاد نظموں میں موضوعات کا عموماً اور نئے پن کی جستجو بہت ہے۔ ان کی نظمیں ”ساقی“، ”رقنا“ اور ”ادب لطیف“ جیسے رسائل میں شائع ہونے لگیں۔ نظموں کا مجموعہ ”بادبان اور دوسری نظمیں“ کے عنوان سے حلقہ ارباب ذوق، نکلنوں کے زیر اہتمام شائع ہوا۔ ان کی شاعری کی بھرپور پذیرائی ہو رہی تھی۔ نظموں کے علاوہ ان کی غزل گوئی نے بھی اہل نظر کو متاثر کیا۔

ایک دل ہے کراہتا ہے تو بستا ہی نہیں ایک بت خانہ ہے اجڑے تو حرم ہوتا ہے

یا

کچھ لوگ جو خاموش ہیں یہ سوچ رہے ہیں کچھ بولیں گے جب سچ کے ذرا دام بڑھیں گے

یا

بات کرتا ہے بہ ظاہر بڑی سادہ سی کمال جو سخن ور ہیں وہی اس کے سخن تک پہنچے

جیسے کچھ بہت اچھے اشعار کمال احمد صدیقی نے اردو شاعری کو دیئے۔ لیکن وہ مضطرب تھے کہ کچھ اور چاہئے وسعت میرے عیاں کے لئے۔ پروفیسر حقیق اللہ ان کی اس بے چینی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

”کمال احمد صدیقی اپنے معاصرین میں سب سے مختلف دمج رکھتے تھے۔

شاعری سے ادبی سطر کا آغاز کیا اور عرصہ دراز تک صرف اور صرف شاعری حیثیت ہی سے پہچانے گئے اور اس پہچان پر قائم وقایع بھی رہے۔ طبیعت کی بے چینی کو کیا نام دیجئے چپکے چپکے چھٹنا نہیں آیا۔ اچھے خاصے شاعر تھے۔ پالا بدلا اور تحقیق جیسے فنک اور محنت طلب اور صبر آزما میدان کی راہ لی۔“ (پروفیسر حقیق

اللہ: ایک ستارہ جو بحر نیلگوں میں ڈوب گیا، ماہنامہ اردو دنیا، فروری ۲۰۱۳ء)

دراصل کمال احمد صدیقی کی اسی اضطرابی کیفیت کے صدقے میں کچھ بہت اہم تحریریں منظر عام پہ آئیں۔ بطور براڈ کاسٹران کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن نشریات کے حوالے سے ان کی بہت اہم کتاب ”ریڈیو اور ٹیلی ویژن میں ترسیل و ابلاغ کی زبان“ منظر عام پہ آئی۔ آپ کی ایک شناخت ماہر لسانیات کی بھی ہے۔ اردو زبان کے آغاز و ارتقاء کے حوالے سے آپ کی بہت اہم تحریریں موجود ہیں۔ ”مقدمہ زبان اردو“ ایک ایسی ہی اہم کتاب ہے، جس کا انتساب فنی پریم چند، فراق گورکھپوری، آئندہ نرائن طاء، جسٹس مارکنڈے کالجیو، جسٹس خیرتھ سنگھ ٹھاکر، گوپی چند نارنگ اور پریت پال سنگھ جتاپ کے نام ہے۔ اس کتاب کا دیباچہ مشہور کیونسٹ لیڈر کامریڈ ہرکشن سنگھ سرجیت نے لکھا ہے۔ اس کتاب میں نہ صرف اردو زبان کے آغاز و ارتقاء سے بحث کی گئی ہے بلکہ اردو کے تمام مسائل کو موضوع بنایا گیا ہے۔ آزاد ہندوستان میں اردو کی بقاء اور ترویج و ترقی کی راہ میں جتنی رکاوٹیں پیدا کی گئیں، ان کا خصلہانہ جائزہ اس کتاب میں موجود ہے۔ کمال احمد صدیقی ماہر عروض کی حیثیت سے بھی خاصی شہرت رکھتے تھے۔ عروض کے حوالے سے ہر بحث میں بلا

چڑھ کے حصہ لیتے تھے۔ ”آہنگ اور غروض“ آپ کی بہت اہم کتاب ہے۔ جس کے کئی ایڈیشن شائع ہو کر مقبول خاص و عام کا درجہ حاصل کر چکے ہیں۔

کمال احمد صدیقی نے مرزا غالب پہ جو اہم کام کئے ہیں اس کی بنا پہ غالب شاعری کے باب میں بھی ان کا نام بے حد اہمیت کا حامل ہے۔ خوبصورت الطاف حسین حالی، علی حیدر نظم علیا ملہائی، حسرت موہانی، سید احتشام حسین، مسعود حسن رضوی، قاضی عبدالودود، مولانا امتیاز علی خان مرثی، مالک رام، کالی داس گپتا، رضا، شمس الرحمن فاروقی، پروفیسر شبیم حق، پروفیسر محمد حسن، پروفیسر قاضی افضل حسین، پروفیسر قاضی جمال حسین جیسے اہم ماہرین غالبیات کی فہرست میں کمال احمد صدیقی کا نام بھی شامل ہے۔ تحقیق و تدوین کی طرف انہوں نے توجہ کی تو غالب کے املا، لغت اور خطوط شاعری میں انھیں لطف آنے لگا۔ سید مظفر حسین برنی لکھتے ہیں:

”۱۹۶۹ء میں، جب سارے ملک میں جشن غالب منایا گیا، تو حکومت کشمیر نے بھگوان سہائے (گورنر) کی سرپرستی اور نظام محمد صادقی (وزیر اعلیٰ) کی صدارت میں ریاستی یادگار غالب سمیٹی قائم کی، اور کمال صاحب کو اس کا سیکرٹری مقرر کیا۔ اسی زمانے میں ایک خطوط بھوپال سے براہ کیا گیا، جسے دیوان غالب غلام غلام غالب بتایا گیا۔ اس پر کمال صاحب نے کام کیا، ایک ایک حرف کو پرکھا اور کتاب ”بیاض غالب: تحقیقی جائزہ“ لکھی، جو پروفیسر محمد حسن کے الفاظ میں ”اب تک کی سب سے اہم تحقیقی کتاب“ ہے، اس میں انہوں نے نہ صرف اندرونی شہادتوں سے خطوط پر کھینچے کا طریقہ کار واضح کیا، بلکہ غالب کے شعر کی پرکھ کے بھی اعلیٰ نمونے پیش کئے ہیں“ (سید مظفر حسین برنی: پیش نظر، غالب کی شاعری، غالب انسٹی ٹیوٹ، دہلی، ۱۹۹۷ء)

کمال احمد صدیقی کی دو اہم کتابیں ”بیاض غالب: تحقیقی جائزہ“ اور ”غالب کی شاعری“

غالبیات کے باب میں اضافہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ”بیاض غالب: تحقیقی جائزہ“ پہلی مرتبہ ادارہ مطالعات غالب، سری نگر، کشمیر سے شائع ہوئی، جبکہ ”غالب کی شاعرت“ کی اشاعت ۱۹۹۷ء میں غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی سے ہوئی۔ سید مظفر حسین برنی نے بھوپال سے مخطوطہ برآمد ہونے کے جس واقعے کا ذکر کیا ہے، وہ جب نسخہ عرشی زادہ کے نام سے مظفر عام پ آیا تو کمال احمد صدیقی نے اسے ایک جعلی نسخہ قرار دیا۔ ”ایک جعلی نسخہ“ کے عنوان سے ایک بھرپور مضمون ان کی کتاب ”غالب کی شاعرت“ میں شامل ہے۔ وہ سوال کرتے ہیں کہ نسخہ عرشی جانی جسے دیوان غالب اردو، نسخہ عرشی نقشب جانی کے نام سے موسوم کیا گیا ہے، اس کا مرتب کون ہے؟ کمال احمد صدیقی شواہد پیش کرتے ہیں کہ مرتب مولانا امتیاز علی خان عرشی نہیں ہو سکتے، بلکہ یہ اکبر علی خاں عرشی زادہ کا کام ہے۔ کمال احمد صدیقی نے جب اس نسخے کو جعلی نسخہ قرار دیا تو مشہور محقق مالک رام نے مضامین لکھ کر اس مخطوطے کو غالب کی خود نوشت بیاض تسلیم کرتے ہوئے اسے میرزا کے اردو کلام کا سب سے پرانا مخطوطہ قرار دیا۔ پھر تو مولانا عرشی اور عرشی زادہ کے ساتھ ساتھ مالک رام بھی کمال احمد صدیقی کے نشانے پہ آ گئے۔ کمال صاحب بڑی بے پاکی سے لکھتے ہیں:

”مالک رام کا شمار اس عہد کے مقہور غالب شناسوں میں ہوتا ہے۔ لیکن وہ نسخہ جو ۱۹۶۹ء میں دریافت کیا گیا، اس کے سلسلے میں موصوف کا روپہ طبعی یا تحقیقی نہیں، بلکہ ایک فریق کے وکیل کا ہے، اور ایسے وکیل کا جس نے نہ کوئی شہادت پیش کی، نہ کوئی تجزیہ کیا، نہ کوئی استدلال پیش کیا، اور نہ کوئی منطقی پیش کی۔“

کمال احمد صدیقی یہی نہیں غصہ کرتے، وہ مالک رام کی طرف داری پہ طنز کرتے ہیں۔ لہجے کی گلی کا اعزاز ان کے اس اقتباس سے ہوگا۔

”ایک ایسے مغلہ نام کے ایک ایسے ہی مغلہ سے یہ کہہ سکتے ہیں۔“

ہر انھیں شہ کرنا چاہئے تھا، مالک رام نے زبان کے سلیطے میں معمولی احتیاط بھی روا نہ رکھی۔ محقق کی زبان بھی وہی ہوتی ہے، جو تھوک اور پرچن کے بعد پار یوں کی۔ لیکن زبان کے برستے میں تھوڑا فرق ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر یہو پار ی تو اپنا مال بیچنے کے لئے یہ کہہ سکتا ہے کہ جناب یہ جاگید سب سے بہترین ہے۔ مالک رام نے بھی یہ لکھ کر کہ ”اس وقت تک جتنے نئے دریافت ہوئے ہیں، یہ ان میں سب سے قدیم ترین ہے، ایک مشکوک نئے کو بیچنے کی کوشش کی ہے۔“ (کمال احمد صدیقی: غالب کی شناخت، ص ۱۳۳)

کمال احمد صدیقی غلط پسند نہیں، مجلسی آدمی تھے۔ ادبی مجالس میں ہرے جوش و خروش سے حصہ لیتے۔ بحث جب تک چل سکے چلے۔ بحث سے گھبرائے نہیں، اور بھاگتے بھی نہیں۔ جن موضوعات پر ان کی گہری نظر نہیں تھی ان پر بھی فیصلہ کن گفتگو کے عادی تھے۔ مطالعہ وسیع تھا اور یادداشت بھی اچھی تھی اس لئے ادبی مجالس میں اپنی طبیعت کا بھرم قائم رکھتے۔ ایسے مجلسی شخص سے تحقیقی کام کی توقع نہیں کی جاتی ہے۔ لیکن کمال صاحب تو کمال صاحب تھے۔ مجلسی بحث و گھرار اور تحقیقی کاوشوں کے درمیان تال میل بٹھانا کوئی کمال احمد صدیقی سے سکھے۔ جس زمانے میں وہ اپنی کتاب ”بیاض غالب: تحقیقی جائزہ“ پر کام کر رہے تھے، ان کے پاس وسائل نہیں تھے۔ بغرض ملازمت وہ کشمیر میں سکونت پذیر تھے۔ وہاں ان کے پاس بہت سی کتابیں نہیں تھیں۔ وہ ای میل، وہاں ایپ اور آن لائن کا زمانہ نہیں تھا کہ اک آن میں مطلوبہ کتابیں یا دیگر مواد حاضر ہو جائے۔ لیکن کمال احمد صدیقی نے اپنی لگن اور محنت سے بہت سی کتابیں جمع کیں۔ اور پھر پھر مطالعے کے بعد بیاض غالب پر اپنی رائے کا اظہار کیا۔ وہ لکھتے ہیں:

”غالب کے جتنے مطبوعہ نسخے مل سکے، میں نے ان کا کھلی مطالعہ کیا۔

جناب امتیاز علی مرثی اور جناب مالک رام صاحب کے مرتب کئے ہوئے نسخے

زیادہ درست پائے۔ لیکن ان میں بھی کچھ غلطیاں تھیں۔ چاہیے ہیں اور یہ غلطیاں اختلافِ نسخ کی وجہ سے نہیں ہیں۔ مالک رام صاحب نے اٹھا چونکہ موجودہ اسلوب کے مطابق لکھا ہے اس لئے جہاں جہاں 'یاں' کے بجائے یہاں لکھا ہے، وہ بہت گراں گزرتا ہے۔" (کمال احمد صدیقی: بیاض غالب: تحقیقی جائزہ، ص ۹)

مالک رام صاحب کا بھرپور احترام کرتے ہوئے کمال احمد صدیقی نے ان کی اس روش کو بار بار ناقابلِ قبول قرار دیا ہے، جہاں وہ کلام غالب کا اٹھا موجودہ اسلوب کے مطابق لکھتے ہیں۔ سچ بات یہ ہے کہ بعض مقامات پر مصرعے بحر سے خارج ہو جاتے ہیں۔ شعر وزن میں نہ ہوں تو پھر اس سے زیادہ قابلِ اعتراض بات اور کیا ہو سکتی ہے؟ مثال کے طور پر غالب کا یہ شعر ہے:

لکھا کرے کوئی احکام طالعِ مولود
کسے خبر ہے، کہ وہاں جنہشِ قلم کیا ہے

کمال صاحب نے اعتراض کیا ہے کہ اگر اس شعر میں "وہاں" کو "واں" کے وزن پر نہ پڑھا جائے تو شعر ناموزوں ہو جاتا ہے۔ مالک رام نے فٹ نوٹ بھی نہیں لکھا ہے کہ وضاحت ہو جائے کہ کسی نسخے میں "واں" بھی استعمال ہوا ہے یا نہیں۔ چونکہ غالب "واں" اور "وہاں" دونوں لکھتے تھے۔ مثال کے طور پر غالب کا شعر ہے:

ہم وہاں ہیں، جہاں سے ہم کو بھی کچھ ہماری خبر نہیں آتی

ایسے بے شمار مقامات ہیں جہاں کمال احمد صدیقی نے مالک رام کی گرفت کی ہے۔

کمال احمد صدیقی نے ایک ایسے محقق کے طور پر اپنی پہچان بتائی جو فیصلہ سنانے کے انداز میں گفتگو کرے۔ کمال صاحب کی طبیعت میں ضد بھی بہت تھی۔ جس بات پر اڑتے تھے اسے منوانے کی بھرپور کوشش کرتے۔ شواہد جمع کرتے، دلائل پیش کرتے اور دو ٹوک فیصلہ سنا

دیتے۔ ”ایک جھلی نسخہ“ والے معاملے میں ایک حد تک کمال صاحب نے مولانا امتیاز علی خاں عرشی کو بخش دیا تھا۔ نشانے پہ عرشی زاوہ تھے اور ان کی حمایت کرنے پہ مالک رام کو بھی انھوں نے نشانے پہ رکھا۔ لیکن عرشی صاحب کو بھی کب تک بخشے؟ اپنے اسی مضمون میں لکھتے ہیں:

”مالک رام اور امتیاز علی خاں عرشی، دونوں نے غالب پہ لکھے وقت خطوط غالب سے بھرپور استقاوہ کیا ہے۔ مولانا عرشی تو مکاتیب غالب کے مرتب بھی ہیں۔ ان کی نظر میں یہ باتیں ضرور ہوگی، اور وہ ایک ایسے نسخے کو کھرا ہونے کی سند نہیں دے سکتے تھے۔ دینا سچے میں جو عبارت مولانا عرشی سے منسوب کی گئی ہے۔ وہ الحاقی ہے۔ اور اگر پہ فرض بحال یہ مولانا عرشی کی تحریر ہے۔ تو مالک رام کی تحریر کی طرح چھل قبول نہیں۔“ (کمال احمد صدیقی، غالب کی

شناخت، ص ۱۳۶)

کمال احمد صدیقی: ”خطوط ششماہی“ اور ”خطوط طے کی پرکھ“ کے عنوان سے دو بے حد اہم مضامین لکھ کر غالبیات کے حوالے سے کام کرنے والے ریسرچ اسکالرس کی راہ آسان کر دی ہے۔ چونکہ خطوط ششماہی ایک علمی اور تحقیقی معاملہ ہے، اس لئے اس کے اصول و ضوابط سے بھرپور آگاہی کے بغیر کلام غالب کی تدوین کا کام مزید گمراہی کا سبب بنے گا۔ ”مہجد غالب کا فکری پس منظر“ اور ”موازنہ ذوق و غالب“ جیسے مضامین لکھ کر کمال احمد صدیقی نے نہ صرف کلام غالب بلکہ مہجد غالب کے شعری امتیازات سے بحث کی ہے۔ ”غالب اور لغت“ اور ”آجنگ“ جیسے Thought Provoking مضامین بھی ان کی کتاب ”غالب کی شناخت“ میں شامل ہیں۔ غالب اور مہجد، غالب کے حوالے سے اپنی ان تمام تحریروں کی روشنی میں کمال احمد صدیقی غالب شناسوں میں ممتاز نظر آتے ہیں۔



ڈاکٹر تنہی اقبال

غالب کی شاعری کا صوفیانہ مزاج (غالب کے کردار و اخلاق کی روشنی میں)

اردو شاعری میں تصوف کی مستحکم روایت رہی ہے۔ ابتدائی زمانے سے ہی فارسی کے دیگر شعری نکات کی طرح تصوف کو بھی شعرائے اردو نے ملحوظ رکھا۔ امیر خسرو کے بعد سرتاج دکن میں قلی قطب شاہ سے لے کر دلی دکنی اور سراج اور رنگ آبادی تک تصوف کا رنگ گہرا ہوتا گیا۔ بعد میں دلی دکنی کے ہمراہ اردو شاعری نے جب شمالی ہند کا سزا اختیار کیا تو یہاں بھی شعرائے تصوف کو شاعری کا موضوع بنایا۔ دلی دکنی کی آمد کے بعد شمالی ہند کے شعرا میں مظہر جان جاناں کا نام اہمیت کا حامل ہے۔ مہد میر و سودا میں میر تقی میر نے بھی اس پر طبع آزمائی کی جبکہ اسی مہد میں خواجہ میر درد صوفی شاعر کی حیثیت سے زیادہ نمایاں رہے۔ چونکہ عملاً اور مرزا جانوہر صوفی واقع ہوئے تھے اسی لئے ان کے یہاں صوفیانہ نکات پر تنقید کی سے طبع آزمائی کی گئی جو سچائی اور خلوص سے مالا مال ہے۔ بعد میں غالب سے لے کر مہد جدید کے شعرائے بھی تصوف کی روایت کو زندہ رکھا۔ دیوان غالب کے مطالعے سے یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ غالب کے دیوان میں صوفیانہ اشعار خاصہ تعداد میں شامل ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ کہیں ان اشعار پر فکر کا پردہ حائل ہے اور کہیں فلسفہ کا۔ اس لئے عام قاری کے لئے غالب کے کلام میں متصوفانہ نکات کی تلاش و جستجو ایک مشکل ترین مرحلہ ہے۔

اسلامی دنیا کی بد امنی اور انتشار و اضطراب نے حساس اور خدا رسیدہ بندوں کو صوف پرش ہو کر امن کی راہوں پر رواں دواں ہونے کی تحریک پیدا کی۔ خدا کے یہ نیک بندے مختلف دشوار گزار

مراحل کو طے کرتے ہوئے ہندوستان میں داخل ہوئے۔ ہندوستان میں وارد ہونے والے صوفیوں کے چار اہم سلسلوں کا پتہ ملتا ہے۔ ان تمام سلسلوں سے وابستہ صوفیائے کرام نے معبود حقیقی کی رضا مندی کے حصول کے لئے ظاہری و باطنی طہارت کے ساتھ ہی خود کو قابو میں رکھا۔ خوش اخلاقی اور صبر و تحمل کو اپنا شیوہ بنایا۔ امداد باہمی، خلوص و ہمدردی، انسان دوستی اور دوسروں کی رہبری ان کا پسندیدہ شغل رہا۔ دنیا کے عیش و آرام کو تھک کر روٹیٹی اختیار کی۔ اپنے اخلاق و کردار سے لوگوں کو اپنا فریضہ بنالینے میں کامیاب ہوئے۔ دراصل یہی وہ سیدھا راستہ ہے جو راستہ طور پر معبود حقیقی تک پہنچتا ہے۔ سب ہی سلسلوں کے صوفیوں کا شمار اپنے زمانے کے ادبا و شعرا میں ہوتا ہے۔ صوفیوں کی ابتدائی کاوش نے تصوف کو اردو شاعری کا بیش بہا سرمایہ بنا دیا۔ تصوف کے مختلف دہستانوں کے امتیازات سے قطع نظر تصوف کے اخلاقی و انسانی پس منظر نے کسی نہ کسی طور پر ہر عہد کی شاعری پر اپنے نقوش ثبت کیے ہیں۔

ایران کی طرح ہندوستان کی فضا بھی تصوف کے لئے سازگار تھی۔ فارسی شاعری کی طرح اردو زبان نے بھی فلسفہ تصوف کی خوب آبیاری کی۔ شعرائے اردو نے ہندوستان کی زمین میں اس پودے کی جڑوں کو گہرائی تک پیوست کر کے ان صوفیائے کرام کو خراج عقیدت پیش کیا جنہوں نے ہندوستان کو اسلامی تعلیمات سے آراستہ و بھراستہ کیا ہے۔ ان اہل سخن حضرات کی مہربانیوں سے تصوف جہروں اور خافاہوں سے نکل کر عوام کے دلوں میں گھر کرنے لگا۔ غالب بذات خود صوفی نہ تھے مگر صوفیوں سے ان کے اچھے مراسم تھے۔ سید علی ہاشمی کا شمار خواہ میر درد کے بعد دہلی کے صف اول کے صوفیوں میں ہوتا ہے۔ غالب اور ان کے درمیان پر خلوص تعلقات کا ثبوت وہ خطوط ہیں جن کا سلسلہ دلوں کے مابین قائم رہا۔ دراصل تصوف کے معاملات میں ہاشمی نے ہی غالب کی راہ ہموار کی۔ غالب کو حق پرست اور حق پرور صوفیوں سے بچی عقیدت تھی۔

ابتدا میں ہر فنکار محققین کے نقش پر چلنے کی کوشش کرتا ہے۔ بعد میں اس کا ذہن اور اس کے تجربات و مشاہدات خود اس کی رہنمائی کرتے ہیں اور اس طرح اس کی انفرادی شناخت قائم ہوتی

ہے۔ غالب نے بھی حقد میں شعرا کے کلام کا بخوبی جائزہ لیا، ان سے متاثر بھی ہوئے مگر ان کے قدموں کے نقوش پر دور تک نہیں جاتے بلکہ جلد ہی ان کے قدم لوٹ آتے ہیں اور اپنی الگ راہ کا تعین کرتے ہیں۔ اس ضمن میں وہ غور و فکر سے زیادہ کام لیتے ہیں۔ تصوف کی کائنات بہت وسیع ہے۔ عشق حقیقی، معرفت، واکل، مبر و قمل، منکوبقا، دنیا کی بے ثباتی، وحدت الوجود، وحدت الشہود، اخلاقی تعلیم، روحانیت اور انسانیت وغیرہ تصوف کے بنیادی نکات ہیں۔ ورد جیسے صوفی شاعر نے بحسن خوبی ان تمام نکات کو اپنی شاعری میں پیش کیا ہے۔ لیکن غالب نے اپنے کلام کو اصولی بندشوں سے ہمیشہ آزاد رکھا۔ تصوف کے روحانی تجربوں میں غالب کو کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ان کے نزدیک عرفان الہی کے لئے صرف تصوف کے اصولی نکات کافی نہیں ہیں۔ اس امر میں وہ انسانی اقدار کو لازمی قرار دیتے ہیں اور اس کی بنیادوں کو استوار کرنے کی سعی میں عملی طور پر کوئی قدم اٹھانے سے گریز نہیں کرتے۔ ان کی نظر میں انسانیت کو سمجھنا اور اس کے حفظ کے لئے عمل پیرا ہونا انسان کا فرض ہے۔ یہی زندگی کی بنیاد ہے۔ لہذا اسی بنیاد کو عرفان الہی کا وسیلہ بنایا جانا چاہئے۔ خدائے حقیقی ہی تمام مخلوق کا مالک ہے اس لئے اس کی مخلوق کے ساتھ ہمدردانہ اور مخلصانہ رویہ اختیار کرنا چاہئے۔ مخلوق کی بھلائی سے ہی ہم خدا کی خوشنودی حاصل کر سکتے ہیں۔ غالب دراصل سکھ، ذہن کے انسان تھے۔ انسانیت ان کا مذہب تھا۔ انھیں کسی مسلک اور کسی عقیدے سے نفرت نہ تھی۔ سب کی دل جوئی اپنا فرض سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک دوران مغلظونری برکتا خوش کلائی سے پیش آنا، بد اخلاقی اور بد زبانی سے پرہیز کرنا، انسانی فریضہ میں شامل تھا اس لئے وہ کہتے ہیں:

گرمی سہی کلام میں لیکن نہ اس قدر کی جس سے بات اس نے شکایت ضرور کی
اپنے کلام میں ایک جگہ فرماتے ہیں:

صادق ہوں اپنے قول میں غالب، خدا گواہ کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے
مذکورہ اشعار میں جن نکات کی وضاحت ہوتی ہے وہ اسلام کی بنیادی تعلیم میں شامل

ہے۔ حق کوئی، صاف کوئی اور انصاف پسندی، انا اور خودداری غالب کے مزاج کے وہ عناصر ہیں جن سے غالب کی شخصیت کو توانائی حاصل ہوتی ہے۔ غالب کسی کو بھی حقیر اور ذلیل و خوار سمجھتے اور حقوق سے محروم رکھنے کے قائل نہیں۔ غالب نے انسانی اور اخلاقی اقدار کو تازہ زندگی بخون رکھا اس لئے ایک مقام پر محض اپنی باوجود خواری کو صوفی ہونے کی راہ میں حائل تصور کرتے ہیں۔ ایسی صورت حال میں اپنی ذات کے متعلق بڑی بے باکی سے کہتے ہیں:

یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالب

تھے ہم ولی سمجھتے جو نہ باوہ خوار ہوتا

غالب کو اس بات کا احساس تھا کہ وہ تمام تر انسانی اقدار اور حقوق تصورات و خیالات کے سچے ہیرو ہیں مگر ان کی رہنمائی صوفی ہونے کی راہ میں حائل ہے۔ دوسری طرف یہ اپنی ذات کو ساقی دینا اور ساغر و مینا کا اسیر پاتے ہیں۔ یہی وہ مقام ہے جہاں غالب کو تصوف کی راہ پر چلنا اور اس پر عمل کرنا اچھائی دشوار معلوم ہوتا ہے۔ جبکہ ولیوں سے ذاتی قربت رکھتے ہیں۔ مندرجہ ذیل شعر سے اس بات کی نشاندہی ہو جاتی ہے کہ غالب تصوف کے مسائل میں الجھنے کی بجائے انسانیت کو آواز دیتے ہیں:

ہاں بھلا کر ترا بھلا ہوگا

اور درویش کی صدا کیا ہے

حالانکہ غالب صوفی منش نہیں تھے۔ نماز روزہ سے بھی میرا تھے اور شراب نوشی کرتے تھے لیکن اپنے اس شغل سے شرمندہ نہیں ہوتے اور نہ ہی اس پر پردہ ڈالتے ہیں۔ بلکہ بڑی ہی خوبصورتی سے انھوں نے اس کی علت بیان کی ہے۔ شعر ملاحظہ ہو:

مے سے غرض نشاط ہے کس رو سیاہ کو

اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہئے

غالب نے غم غلا کرنے کے لئے شراب کا سہارا لیا اور خود کو قابو میں رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ

شراب نوشی کے باوجود غالب نے تہذیب و اقتدار کی پامالی نہیں کی بلکہ اسے بہت ہی احتیاط سے برتا ہے۔ جس عہد میں ان کی شاعری کو عروج و زوال و دور تصوف کے لئے بھی بڑا سازگار تھا۔ عوام کی طبیعتیں رنج و الم میں گرفتار اور ترک دنیا کی طرف مائل تھیں۔ لہذا تصوف پر اعتراضات بھی کئے گئے۔ حالانکہ تصوف بے عملی، فرار اور ترک دنیا کا فلسفہ نہیں مگر حالات کے جبر نے اسے ایسا کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ میر و سودا کے عہد میں زندگی اضطراب اور انتشار سے دو چار ہو رہی تھی۔ غرض اس وقت تصوف ہی ایک ایسا نسخہ کیا تھا جو ہر مرض کی دوا بنا۔ تصوف نے شکست خوردہ ذہنوں کو تسکین دی ہے۔ دل سوختہ کو زندگی کا نیا حوصلہ دیا ہے۔ غالب نے جب خن کوئی کی ابتدا کی تو تصوف پر بھی ان کا ذہن مرکوز ہوا۔ لہذا غالب نے مذہبی حقائق کو اشعار میں بیان کیا جسے صوفیوں کی صحبت نے مزید سنوار دیا تھا۔ غالب کے عارفانہ اشعار کے مطالعے سے یہ بات نمایاں ہوتی ہے کہ غالب معرفت سے سرشار ہیں مگر اس کے اظہار میں وہ ہادہ و ساغر کی دنیا سے باہر نہیں نکل پاتے:

ہر چند ہو مشاہدہ حق کی گفتگو بنتی نہیں ہے ہادہ و ساغر کہے بغیر

غالب کا عارفانہ کلام عقیدہ معنی کا ایک طلسم ہے جس کو سمجھنے کے لئے غالب کے کلام کا حقیق مطالعہ لازمی ہے۔ غالب بھی اکثر شعرا کی طرح وحدت الوجود کے قائل ہیں جس کی رو سے موجودات کی حیثیت محض اعتباری ہے۔ اصل ہستی واجب تعالیٰ کی ہے جو کائنات کی ہر شے میں ہے۔ لیکن کوئی شے واجب تعالیٰ نہیں ہے:

ہر چند ہر اک شے میں تو ہے پر تجھ سی کوئی شے نہیں ہے

غالب پر جب تجرید کی کیفیت طاری ہوتی ہے تو وہ استعجاب کے عالم میں خود مالک بے نیاز سے رجوع ہو کر دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ جب کائنات میں تو ہی تو ہے اور تیرے سوا کچھ موجود نہیں تو پھر دنیا کی یہ ہنگامہ آرائی کیوں ہے؟ دراصل غالب کے یہاں عقل کی روشنی میں تشکیل کا پہلو ابھرنے کا ایک عام صورت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار میں جا بجا استفہامیہ کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے:

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے
 غالب راہ سلوک پر چلنے والے صوفیوں کے ہمنوا نہیں اور نہ ہی کبھی غالب نے اس کا دعویٰ
 کیا۔ لیکن مصوفانہ خیالات و افکار کو انھوں نے اپنی شاعری کے وسیلے سے منظر عام پر لایا اور نہایت
 ہی ساف سقرے انداز میں تصوف کے اہم پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔ خدا اور کائنات کو سمجھنے کی
 کوشش کی ہے۔ زندگی کے اغراض و مقاصد کو جاننا چاہا ہے اور عرفان الہی کے افہام و تفہیم پر انتہائی
 کھنجی کا مظاہرہ کیا ہے۔ غالب نے مصوفانہ نکات کے اسرار و رموز کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ ان
 کے کلام میں تصوف کے مسائل سوالات کی صورت میں ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ مگر ان مسائل کی
 مگر ہیں مکمل نہیں پاتی ہیں۔ بلکہ یہ سوالیہ نشان بن کر ذہن پر دستک دیتی ہیں۔ غالب جیسا نابغہ
 قناعت پر توکل کیسے کر سکتا ہے وہ تو ہر نکات کو سوال کی کڑی سے جوڑ کر اس کی تلاش و جستجو میں
 سرگرداں نظر آتا ہے۔ غالب کو تصوف کی وادی میں سیر کرنے اور اس سے لطف اندوز ہونے میں
 سرور کا احساس ہوتا ہے۔ وحدت الوجود کے عقیدے کو غالب کے فکر میں بڑی اہمیت حاصل
 ہے۔ اس عقیدے کی بنیاد یہ ہے کہ یہ پوری کائنات خدا سے علاحدہ کوئی وجود نہیں رکھتی۔ انھوں
 نے وحدت الوجود کے صرف ان عناصر کو قبول کیا جس سے ذات کی نفی نہیں ہوتی بلکہ اثبات ہوتا
 ہے۔ خدا کے تصور کی عکاسی غالب کے چند اشعار سے ہوتی ہے:

اے کون دیکھ سکتا ہے کہ پگانہ ہے وہ یکتا جو دوئی کی یو بھی ہوتی تو کہیں دو چار ہوتا

ہر چند ہر اک شے میں تو ہے پر تجھ ہی کوئی شے نہیں ہے

تمام مذاہب نے دنیا کی بے ثباتی اور انسان کے فانی ہونے پر زور دیا ہے۔ لیکن اس کا یہ
 مطلب نہیں کہ دنیا سے کنارہ کشی اختیار کر لیا جائے اور زندگی میں درپیش آنے والے مسائل کو خدا
 کی مرضی سمجھ کر دعا و تقویٰ میں اس کا حل تلاش کیا جائے۔ حالات کا تجزیہ کرنے کی بجائے قسمت
 پرستی کا راگ الاپا جائے۔ مرزا غالب مذہب اسلام سے وابستہ تھے اور اس سے متعلق یہ امر بالکل
 درست ہے کہ یہ بے عملی کا درس نہیں دیتا اور نہ ہی زندگی سے بےزاری سکھاتا ہے۔ مگر دور انحطاط

نے اپنی بے حس و مجبوری کو تقویت پہنچانے کے لئے مذہب کے نئے نئے پہلو تلاش کئے جن سے انسانوں کو بے عملی کی ترغیب ملتی تھی۔ انسان خود کو مجبور محض سمجھتا رہا۔ غالب کی شاعری میں جگہ جگہ فنا کی اہمیت کے اشارے ملتے ہیں۔ دنیا کی بے ثباتی اور کائنات کے فنا ہونے کے متعلق غالب کا کلام ملاحظہ ہو:

پرتو غور سے شبہم کو ہے فنا کی تعلیم میں بھی ہوں ایک منایت کی نظر ہونے تک
فنا کو سوپ کر مشتاق ہے اپنی حقیقت کا فروغ طالع غاشاک ہے موقوف گلشن پر
فنا ہر شے اور ہر انسان کی تقدیر ہے اس لئے صوفیائے بھی دنیا کی لذتوں کو ترک کرنے کی تعلیم
کے ساتھ ہی عاجزی و انکساری کی بھی تلقین کی۔ مگر یہ غالب کی زندگی کا حصہ نہ بن سکے۔ بلکہ وہ ساری عمر دنیا کے تماشاؤں اور لذتوں کے آرزو مند رہے۔ مزاج اور طبیعت کے لحاظ سے غالب پر دنیا داری کے اثرات زیادہ غالب تھے۔ وہ تازہ زندگی حسن کے قدروں اور اس کے حصول کے خواہش مند رہے۔ غالب خود پرست تھے اور ان کی خود پرستی بھی غصب کی تھی۔ غالب کی خود پرستی میں وہ اتانیت چھائی ہوئی تھی کہ عشق بھی کیا تو اپنی ہی ذات سے۔ وہ خود کو مذہب اسلام سے وابستہ جانتے مگر تمام عمر نماز روزہ سے میرا ہی رہے۔ وہ کہتے ہیں:

جاننا ہوں ثواب طاعت و زہد پر طبیعت اور نہیں آتی
عاجت مندوں کی نوازش غالب کی زندگی کی ایک بدیہی حقیقت ہے۔ ان کی دلہیز سے سائل خالی ہاتھ واپس نہیں جاتے تھے اس لئے ہمیشہ مظلوموں اور محتاجوں کی ایک قطار غالب کی عناہوں کی منتظر رہتی۔ یہ غالب کی زندگی کا مثبت پہلو کہا جاسکتا ہے۔ غالب اپنی نام و نسب حضرات کی ولداری اور کرم فرمائی کا معائنہ کرنے کے لئے فقیروں اور درویشوں کا روپ اختیار کرتے ہیں مگر حقیقی طور پر صوفی کا وضع قطع اختیار کر کے صوفیوں کے گروہ میں شامل ہونے کے خواہاں نہیں۔ ان کا یہ شعر پیش کرتی ہوں:

ہاں کر فقیروں کا ہم ہمیں غالب تماشاے اہل کرم دیکھتے ہیں

”دل“ تصوف کا سرچشمہ ہے اور عشق و محبت کے معاملات بھی دل ہی سے وابستہ ہیں۔ یہ بھی ایک روحانی تعلق کا نام ہے اور روحانیت بھی تصوف کی ایک کڑی ہے۔ عشق کو تمام صوفی شعرا نے اپنا موضوع بنایا ہے۔ یہ عشق حقیقی ہے جہاں براہ راست معبود حقیقی سے عشق کا اظہار مقصود ہوتا ہے۔ معبود حقیقی سے محبت کا اظہار صوفیانہ شاعری کا سب سے اہم موضوع ہے۔ فارسی شاعری کے زیر اثر ہندوستانی شعرا نے بھی جو ارضی اور ہسانی محبت کے گیت گاتے تھے اس تصور عشق سے اپنی شاعری میں ایک پاکیزہ، ارفع اور اعلیٰ عنصر محبت اخذ کیا ہے۔ دلی، سراج، درد، میر، حسرت، اصغر وغیرہ کی غزلیں محبت کے اس تصور سے بھری پڑی ہیں۔ تصوف میں محبت کو ایک مستقل موضوع کی صورت میں سامنے لانے والی شخصیت رابعہ بصری کی ہے۔ انھوں نے اپنے نعمات عشق سے مخصوصانہ ادب کی ابتدا کی ہے۔ محبت کا یہ تصور صوفیانہ شاعری میں خاص طور پر مقبول ہوا۔ محبت کا یہی ترانہ فارسی کے اثر سے اردو میں آیا۔ غالب نے ایک جگہ تحریر کیا ہے۔

طاقت میں تار ہے نہ سودا گلیں کی لاگ دوزخ میں ڈال دے کوئی لے کر بہشت کو

غالب کی بلا حصر و طبع محبت خداوندی تصوف کا نقطہ عروج ہے۔ سب سے پہلے رابعہ بصری نے بلا انعام و اجر محض عشق الہی سے سرشار ہو کر عبادت و ریاضت کی راہ دکھائی تھی جسے شعرا نے اپنے اشعار کا موضوع بنایا۔ غالب نے اس موضوع پر خوب طبع آزمائی کی ہے۔

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزہ پایا درد کی دوا پائی درد ہے دوا پایا

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

لیکن علاء الدین طائی کے نام ایک خط میں انھوں نے عشقیہ نوعیت کے اشعار سے متعلق یہ لکھا ہے کہ ”عاشقانہ اشعار سے مجھ کو وہ بُند ہے جو ایمان سے کلر کر“ غالب کا یہ جملہ ہر قاری کو تذبذب میں مبتلا کر دیتا ہے۔ لیکن اس جملے میں الجھنے کی بجائے ہم اسے ان کی مصلحت پسندی کہہ سکتے ہیں۔

غالب کی عشقیہ شاعری کو تصوف کی اصطلاحوں میں قید نہیں کیا جا سکتا ان کا عشق ارضی اور

جسمانی بھی ہے۔ لیکن ان کے یہاں عشق و عاشقی کا تصور اخلاقی اقدار کا حامل نظر آتا ہے۔ غالب کے عشق میں ایک مخصوص قسم کا وقار اور رکھ رکھاؤ ہے اور اس کا سبب تصوف سے وابستگی ہے۔ ان کی شاعری کا مجازی پہلو اثر انگیز ہے۔ ان کے یہاں عشق کے تمام کیفیات و معاملات کی جہی تصویریں ملتی ہیں۔ عشق مجازی میں بھی پاکیزگی، منجیدگی اور محنت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹتا۔ ان کا کلام پیش کرتی ہوں۔

جان دی دی ہوئی اسی کی تھی حق تو یوں ہے کہ حق اور نہ ہوا
ان کے شعر کا ایک مصرع نقل کرتی ہوں۔

نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا

یہ مذہب اسلام کا بنیادی تصور ہے جسے مرزا نے بہت خوبصورتی سے اپنے نزل کے ایک مصرع میں پیش کر دیا ہے۔ ان کی شاعری میں بے نیازی اور جلال و جمال کے صفات بھی ملتے ہیں۔ یہ تمام امور تصوف کے ہیں اس لئے ہم انھیں صوفیانہ تصورات کا بہترین عکاس کہہ سکتے ہیں۔

غم اور احساس غم بھی تصوف سے وابستہ ہے۔ شکستہ دل انسان بھی غم کی شدت کے ساتھ خدا کی جانب رجوع ہوتا ہے جہاں اسے تسکین حاصل ہوتی ہے۔ غالب کے رنج و الم کا جہاں تک تعلق ہے تو وہ غم عشق سے زیادہ غم روزگار کے ستائے ہوئے تھے۔ روپیوں کی قلت نے انھیں دیار غیر کا دورہ کرنے پر بھی مجبور کر دیا تھا۔ حالات کے اضطراب و انتشار نے بھی انھیں افسردہ کیا تھا۔ دوستوں کی جدائی کا بھی انھیں صدمہ تھا۔ دلی کی بربادی سے غالب کو جو غم پہنچا تھا وہ جا بجا ان کے خطوط میں نظر آتا ہے۔ سب سے بڑا صدمہ ان کی تنہائی تھی۔ تنہائی نے زندگی کے آخری مرحلے کو مشکل ترین بنا دیا تھا۔ غالب کو شدت سے غم کا احساس تھا۔ یہ غم تصوف کے ذوق کی بنا پر بھی نہ تھا اور نہ ہی عشق کے خلوص اور شدت کے سبب تھا جیسا کہ ان کے خطوط کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے۔ یہ غم روزمرہ کی محرومیوں اور نامرادیوں نے عطا کیا تھا۔ گو کہ ان کا غم زندگی اور حیات کا غم تھا اور انسان کی زندگی کو جب تک موت نہیں آتی تب تک اسے غم سے نجات نہیں ملتی۔ غالب کے کلام

سے یہ شعر نقل کرتی ہوں۔

قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں
نغمہ ہائے غم کو بھی اسے دل غنیمت جانتے بے صدا ہو جائے گا یہ ساز ہستی ایک دن
یہ شعر اس بات کی دلیل ہے کہ مصیبتوں میں بھی غالب کی مثبت سوچ کا چراغ روشن تھا۔
محض غالب کی ذاتی زندگی نہیں بلکہ ان کا پورا معاشرہ ہی رنج و الم کی تصویر بن چکا تھا۔ اپنے
معاشرے کی بربادی پر غالب نے خون کے آنسو بہائے ہیں۔ لیکن زندگی کے تمام خبیث و
فراز کے باوجود انھوں نے صبر و ضبط کا دامن نہیں چھوڑا اسی لئے وہ کہتے ہیں۔

تاب لائے ہی بنے کی غالب

واقعہ سخت ہے اور جاں عزیز

رنج سے خورگ ہوا انساں تو مت جاتا ہے رنج

مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کے آساں ہو گئیں

مسلح ناکامیوں اور مایوسوں کے بعد بھی غالب زندگی سے مفر نہیں ہوئے۔ بلکہ تا مساعہ
حالات نے ان کے دائرہ فکر کو ہالیدیگی اور وسعت عطا کی اور ان میں زندگی جینے کا حوصلہ پیدا کیا۔
غالب خود کو عارف نہیں سمجھتے بلکہ وہ عارف کو صداقت کے آئینے میں دیکھنا چاہتے
ہیں۔ غالب نے عارف کے لئے ایمان و یقین میں پائیداری اور وفاداری کو لازمی قرار دیا
ہے۔ ان کی فکر میں وہ تمام انسان برآہم تھے جنہوں نے سچائی کی تلاش و جستجو میں خود کو غرق کر دیا اور
جو اپنے عقائد پر مضبوطی سے قائم تھے۔ غالب دین و مذہب کے بے معنی حد بند یوں سے بالا
تر تھے۔ لہذا یہ شعر اسی خیال کی ترجمانی کرتا ہے۔

وفاداری بشرط استواری اصل ایماں ہے

مرے بت خانے میں تو تجھے میں گاؤں برہمن کو

شاعری میں بیشتر کعبہ اور بت خانہ جیسے الفاظ کا استعمال خود اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ دونوں

مقامات غالب کے لئے محترم ہیں۔ غالب کے لئے محبت اور ہمدردی ہی انسان کا سب سے بڑا مذہب تھا۔ وہ بنی نو آدم کو انسانیت اور آدمیت کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں اور اپنے تجربے و مشاہدے کی روشنی میں وہ اس نتیجے پر پہنچتے ہیں۔ مصرع نقل کرتی ہوں۔

آدی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

مذکورہ تمام تفصیلات کی روشنی میں غالب کے متعلق خلیق انجم صاحب کا کی یہ رائے بجا معلوم ہوتی ہے کہ ”ایک شاعر کی حیثیت سے وہ ہمارے دکھ درد اور ہماری نفسیاتی الجھنوں کا مددگار ایک مفکر، فلسفی، مصوفی اور اخلاقی مصلح کی حیثیت سے کرتے ہیں۔“ غالب کی فکر اور تخیل کی دنیا بہت وسیع ہے۔ وہ کشادہ ذہن اور کشادہ دل کے مالک تھے۔ بذات خود خدا کے وجود پر ایمان رکھتے تھے اور خدا کے رسول سے گہری عقیدت تھی۔ مگر جملہ مذاہب کو احترام کی نظر سے دیکھتے تھے۔ آج کے معاشرے میں اسی عقیدے اور اسی صوفیانہ فکر کی ضرورت ہے تاکہ سماج میں پیدا ہونے والی نفرت سے مسموم ہوتی فضا کو تحفظ مل سکے۔ انسانیت کے گل بوٹے ہر سوانہا شوخ رنگ نکمیر سکیں جس کی خوشبو ہماری سوچ کو تروتازہ اور مضطر کر سکے۔ ہمارا بھی فرض ہے کہ ہم بلا تفریق مذہب و ملت تمام عبادت گاہوں اور مذہبی مقامات کا احترام کریں۔ ہمارے اس عمل سے مذہبی آزادی اور رواداری کو تقویت پہنچے گی۔ عصری معاشرے کو اسی حیثیت، رواداری اور ہمدردی کی اذ حد ضرورت ہے جن کی تعلیم صوفیانے کرام نے دی اور جنہیں غالب نے اپنے اندر سرایت کر لیا تھا۔ یہ شعر غالب کے صوفیانہ افکار و خیالات اور اخلاق و کردار کا بہترین عکاس ہے۔

آزادہ زد ہوں اور مرا مسلک ہے مسلح کل

ہرگز کبھی کسی سے عداوت نہیں مجھے



شائع کردہ مآثر

اردو صحافت کے علمی و تحقیقی تناظر کا مستند حوالہ: گرہن چنن

گزشتہ دو صدیوں کو محیط اردو صحافت کی مہتمم ہائشان تاریخ کے مطالعہ سے مختلف ہوتا ہے کہ اردو اخبارات نے نہ صرف ملک میں ذہنی بیداری کی راہ ہموار کر کے ہندوستان کی تہذیبی نشاۃ ثانیہ کے خراب کو شرمندہ تعبیر کرنے میں اور جمہوری اقتدار پر مبنی تاریخی معاشرہ کی تشکیل کی راہ بھی ہموار کی۔ اردو صحافت کے احتجاجی اور انقلابی کردار کی عام طور پر تحسین کی جاتی ہے اس امر کو بھی تسلیم کیا جاتا ہے کہ اردو اخبارات نے قومی شخص کی بیداری کا ایک پہلو دار بنایا یہ وضع کیا مگر یہ بھی صحیح ہے کہ اردو صحافت کو عمیق علمی و تحقیقی طریقہ کار کا ہدف نہیں بنایا گیا۔ ہندوستانی صحافت سے متعلق انگریزی میں تحقیقی کتابیں تصنیف کرنے والے حضرات بشمول مارگرٹا بارنس، ناڈگ، کرشنا مورچی، جے ٹی راجن، ایم پیلائی راؤ، ایس ٹی راجن وغیرہ نے اردو اخبارات کا سرسری اور ضمنی انداز میں ذکر کیا اور اردو صحافت کے معروف محققین نے اردو اخبارات کے مطالعہ میں علمی ڈراف نگائی، تحقیقی دیانت داری اور مقدمات کی تدوین اور نتائج کے استخراج میں معروضیت کا لحاظ کم ہی رکھا ہے اور اکثر شخصیات اور مقامات کی نقطہ نظر کو بروئے کار لا کر صحافت کی تاریخ رقم کی ہے اس ضمن میں انسانی مثالیں حقیق صدیقی (دہلی) اور پروفسر طاہر مسعود (کراچی) کی تصانیف ہیں۔ اردو صحافت کی مکمل تاریخ لکھنے والے علامہ انور صابری کی تحریری کاوشیں منضبط تحقیقی اصولوں کی پاسداری کے بجائے ذاتی تاثرات کے عہد پر گردش کرتی ہیں اور شخصیات کو مستند تاریخی ثبوت کے طور پر پیش کرنے کی غیر علمی روش کی غماز ہیں۔ جامعات میں بھی صحافت کو تحقیقی مطالعہ کا موضوع کم ہی بنایا گیا ہے گو کہ اردو کے مسلم الثبوت نثر نگاروں سماجی مصلحین اور سیاسی قائدین کو جن کا صحافت سے بڑا گہرا علمی رشتہ رہا ہے، تحقیقی جائزہ کا مرکز بنایا جاتا رہا ہے اس نوع کے

روایوں میں سرسید، ظفر علی خاں، مولانا محمد علی جوہر، ابوالکلام آزاد، عبدالماجد دریا بادی اور حسرت موہانی وغیرہ کے نام شامل ہیں۔ اردو صحافت کی تاریخ کو معروضیت، تحقیق کے جدید اصولوں اور مستند استادی شہادتوں کے توسط سے مرتب کرنے والوں میں سب سے اہم نام گرچین چندن کا ہے جنہوں نے انسان کی اجتماعی جہذیبی اور ذاتی زندگی پر گہرے اثرات قلم کرنے والے اردو اخبارات کو اپنی تحقیقی اور علمی سرگرمیوں کا مسلسل مرکز بنایا ہے اور اس موضوع پر اردو اور انگریزی میں 4 کتابیں اور متعدد تحقیقی مقالے سپرد قلم کیے۔

گرچین چندن کی تحقیقی کاوشوں کا سب سے بہتر نمونہ اردو کے اولین اخبار جام جہاں تھا۔ متعلق کتاب ہے۔ اردو کا سب سے پہلا اخبار کون سا ہے؟ چندن صاحب کی تحقیق سے قبل مسئلہ خاصہ متنازعہ فیہ تھا۔ مارگرٹا ہانس کے مطابق سید الاخبار جو 1837ء سے شائع ہوا تھا، اولین اخبار ہے۔ تاؤگر کرشنا مورتی نے بھی ہانس کی ہم نوائی کی ہے، محمد حسین آزاد نے اولیت کا سہرا اپنے والد مولوی محمد باقر کے اخبار دہلی اردو اخبار کے سر باندھا ہے۔ مولوی ذکاء اللہ نے ”سید الاخبار“ کو اولین اخبار قرار دیا ہے۔ مگر چندن صاحب نے اس زمانے کی سرکاری دستاویزوں، اخباروں اور کتابوں کے گہرے مطالعہ کے بعد اس امر کی استنادی شہادت پیش کی کہ اردو کا حقیقی اولین و مطلوبہ اخبار جام جہاں تھا جو مارچ 1822ء میں کلکتہ سے جاری ہوا تھا۔ چندن صاحب نے پینٹل آرکائیوز میں دستیاب مواد سے بھی خاطر خواہ استفادہ کیا اور اس بات کی بھی وقتی تردید کہ جام جہاں تھا حکومت برطانیہ کا کاسہ لبس یا حاشیہ بردار اخبار تھا۔ یہ کتاب ”جام جہاں تھا: اردو صحافت کی ابتدا۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نے 1992ء میں شائع کیا یہ کسی ایک اخبار پر مرکوز پہلی تحقیقی کاوش ہے جس میں تحقیقی وقت نظری کا ثبوت دیا گیا ہے۔ اس سے قبل 1986ء میں اردو اکادمی دہلی نے چندن صاحب کی کتاب ”اردو صحافت پر ایک نظر“ شائع کی تھی جس میں ابتداء سے 1982ء تک کے اردو اخبارات کا جائزہ لیا گیا تھا گو کہ جائزہ میں تحقیقی تقاضوں کی

اردو صحافت سے متعلق چند نصاب کے 19 مگر ان قدر تحقیقی مضامین ”اردو صحافت“ کے عنوان سے کتابی صورت میں 2007ء میں شائع ہوئے ہیں۔ یہ کتاب اردو اخبارات کے تاریخی ارتقا سے متعلق سرسری اور روایتی قسم کے مقالوں پر مشتمل نہیں ہے بلکہ اس میں اکیسویں صدی کی اردو صحافت کو درپیش مسائل کو بھی موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ چند نصاب صاحب غیش پا افتادہ حقائق کو درخود اکتفا نہیں سمجھتے ہیں اور اکثر موضوعات کی جو مسلمات کی صورت اختیار کرتے ہیں، بے ماتحتی کو خاطر نشان کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ ”جام جہاں نما“ کو اردو صحافت کے محققوں نے کم ہی مرکز مطالعہ بنایا ہے۔ عبدالسلام خورشید، علامہ انور صابری، رفیق احمد صدیقی اور نادر علی خاں وغیرہ نے اسے حکومت برطانیہ کا طفیلی اور کاسہ لیس اخبار قرار دیا ہے تاہم چند نصاب صاحب نے جام جہاں نما کے مندرجات اور حکومت کے چیف سکریٹری مسٹر ولیم ہرڈ تھ ہیلی کی اس اخبار سے متعلق رپورٹ جو پینٹل آرکائیوز میں محفوظ ہے، کے حوالے سے لکھا ہے کہ جام جہاں نما ایسٹ انڈیا کمپنی کے حکام کو شدید تکلیفی کا نشانہ بناتا تھا اور اسی باعث برطانوی حکام اس اخبار سے بیحد خائف رہتے تھے۔ ہندوستان میں صحافتی قدیم کا آغاز 1823ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے دور اقتدار میں کیا گیا اس وقت کے گورنر جنرل جان ایڈم نے پہلا آرڈر پبلیش جاری کیا تھا۔ چند نصاب صاحب نے اس آرڈر پبلیش کا اصل محرک جام جہاں نما کے مشتملات کو ٹھہرایا ہے۔ انہوں نے اس سلسلہ میں لکھا ہے کہ ”مجھے اپنی تحقیق سے ایک ایسا تجربہ (رپورٹ) ملا جو حکومت کے اس وقت کے چیف سکریٹری جناب ولیم ہرڈ تھ ہیلی نے جام جہاں نما کے چھ شماروں کے مطالعہ سے مرتب کیا تھا۔ اس تجربہ میں انہوں نے کہا کہ یہ اخبار ”انگریزی کا انجمن بن سکتا ہے۔“

چند نصاب صاحب کے مطابق ہیلی کی رپورٹ خاصی تفصیلی ہے اور اس کے کل 77 صفحات میں سے 15 صفحات جام جہاں نما کے ذکر کو محیط ہیں۔ ہیلی نے اپنی رپورٹ میں انگریزی، فارسی اور بنگالی اخبارات کے مندرجات کو موضوع بحث بنایا ہے۔ اس رپورٹ کے مطابق جام جہاں نما سیاسی بیداری کے جذبات پر ابھرتا کرتا ہے اور یہ برطانوی سامراج کے استحکام کے لیے خطرہ بن

نہیں جاری کیا جو بقول مصنف بلی کے خیالات کو قوت دینے والا اور اس باب کے سابقہ ضوابط سے زیادہ سخت اور کڑی مل تھا۔

مولانا آزاد نے اپنا شہرہ آفاق ہفتہ وار الہلال 13 جولائی 1912ء کو جاری کیا تھا اور حکومت برطانیہ نے نومبر 1914ء میں الہلال پر پبس کی 2 ہزار روپے کی ضمانت ضبط کر لی۔ مولانا آزاد کے پائے استقلال میں ذرا جھنجش نہیں آئی اور مولانا نے 18 نومبر 1914ء کے شمارے میں الہلال کو جاری رکھنے کا اعلان کیا۔ اس کے بعد حکومت برطانیہ پھر حرکت میں آئی اور 10 ہزار روپے کی نئی ضمانت طلب کی جس کا انتظام نہ کیا جاسکا۔ حکومت برطانیہ نے الہلال کے خلاف کارروائی کس کی ایما پر کی اور اس کا محرک کون تھا؟ چندن صاحب نے اس اہم سوال کو اپنی تحقیق کا موضوع بنایا اور لکھا کہ حکومت کو الہلال میں شائع ہونے والے دو مضامین حدیث الجہود اور سقوطِ اظہر پر سخت اعتراض تھا۔ جرمن فوجوں نے اتحادی فوجوں کو میدان جنگ میں شکست دی اور اس نے اتحادی حلیف ملکِ بلیجیم پر فتح حاصل کی اور اس کے دارالسلطنت پر قبضہ کر لیا۔ الہلال نے یہ دونوں مضامین متعدد انگریزی اخباروں مثلاً لندن ٹائمز، مورنگ پوسٹ، ڈیلی کرائیکل، بلکوب، انشیس مین، ٹائمز آف انڈیا، رسول ایڈ میلیری گزٹ، لندن نیوز اور انگلش مین میں شائع ہونے والی رپورٹوں اور مضامین سے استفادہ کر کے لکھے تھے مگر حکومت سے زیادہ معاصر انگریزی روز نامہ ”پانیر“ کو الہلال کی یہ سرگرمی انتہائی قابل اعتراض ٹھہرائی اور اس نے ایک اپنے معاصر کے خلاف ایک تیز اور تند آئینکل (ProGermanism in Calcutta) لکھا۔ چندن صاحب نے اس مضمون کا ذکر اپنے مقالے میں کیا ہے اور پانیر کا اقتباس بھی درج کیا ہے۔ پانیر میں شائع ہونے والا مضمون میں لکھا گیا تھا:

”آغاز جنگ کے وقت سے الہلال کی روش حیرت انگیز طور پر بدوجہ بن رہی ہے جو لوگ اخبارات پر جتنے رچے ہیں ان کے لیے یہ امر تعجب انگیز ہے کیونکہ گورنمنٹ اب تک اس کی تحریروں کو برداشت کرتی رہی ہے۔“

شاید پہلا موقع تھا کہ کسی اخبار نے اپنے کسی معاصر کے خلاف کارروائی کرنے کے لیے حکومت سے فوری طور پر اقدام کرنے کا مطالبہ کیا۔ اس ضمن میں چند صاحب نے لکھا۔

الہدال کے اس مواد میں جنگ کی تصویر کے دونوں رخ دکھانے کی کوشش کی گئی لیکن واقعات اور شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ گورنمنٹ نے جنگ کے حقیقی حالات کو، جن کی رپورٹیں اور وضاحتیں سرکردہ انگریزی اخباروں میں کثرت سے چھپ رہی تھیں، نظر انداز کرتے ہوئے الہ آباد کے پورچین اخبار پانیر کے ایک ادارے کی تجویز پر اپنا حکم جاری کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس اخبار نے حکوم کے حکم ضبطی سے دو ہفتہ قبل اپنے 2 نومبر کے شمارے میں الہدال کے جنگی مواد کے خلاف ایک ایڈیٹنگ آرٹیکل لکھا تھا جس کا ترجمہ ہفتہ وار الہدال نے خاصی شبہی سے اپنے 11 نومبر کے شمارے میں پیش کیا۔ اسی شمارے میں الہدال نے پانیر کے آرٹیکل کے مختلف نکات کا دستاویزی جواب بھی دیا۔ یہ سب نصراحت ضبطی کا حکم ملنے سے پانچ دن قبل ہو چکی تھی لیکن معلوم ہوتا ہے کہ مقامی حکام نے اسے قابل توجہ تصور نہ کیا۔“

چند صاحب کی تحریر سے مترشح ہوتا ہے کہ غیر ملکی دور اقتدار میں ہندوستان جن صحافتی یکجہت اور سالیہت (Solidarity) کا تصور جڑ نہیں پکڑ سکا تھا اور اخبار حکومت کی کارروائی ہونے کی صورت میں ایک دوسرے کی اعانت اور دست گیری پر یقین نہیں رکھتے تھے۔

سید عابد حسین کا نام برصغیر کے علمی اور ادبی حلقوں میں محتاج تعارف نہیں۔ ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کی دانشورانہ اساس کو اجاگر کرنے والوں میں عابد حسین کا نام سرفہرست ہے۔ جامعہ سے ان کی ادارت میں شائع ہونے والے رسالے ”اسلام اور عصر جدید“ سے ہر پڑھا لکھا شخص واقف ہے مگر اس سے کم لوگ واقف ہیں کہ تقسیم وطن کے فوراً بعد فرقہ واریت کے جن کو پولس میں بند کرنے کے لیے انہوں نے دہلی سے ایک ہفتہ وار ”نئی روشنی“ نکالا اور اس کا اولین

شمارہ 14، جون 1948ء کو شائع ہوا۔ چندن صاحب نے اپنے مضمون ”صبح آزادی کا قدرِ میل صفت اخبار۔ نئی روشنی“ سے اردو قارئین کو اس اہم اخبار سے واقف کرایا ہے۔ چندن صاحب کے مطابق یہ اخبار الہلال کی طرح 4-”130/20 کے سائز پر دو کالموں میں شائع ہوتا تھا اور صفحات کی تعداد 12 تھی۔ سید عابد حسین نے اپنے افتتاحی ادارے، نئی روشنی کا پس منظر میں لکھا ہے۔

آج ضرورت ہے کہ ہمارے حراج کی ناہمواری دور ہو اور ہمارا ذہن اپنے ماحول کے مطابق ہو۔ اس ماحول کی ایک یادگار صورت مغل حکمران اکبر اعظم کے زمانے میں واقع ہو چکی ہے۔ آج غیر مذہبی یا دنیاوی ریاست کا وہی تصور ہمارے عہد کی ایک بڑی خصوصیت ہے اسے کامیاب بنانے کے لیے ضروری ہے کہ ربحیت پرستی اور قدامت پرستی کے جراثیم کو قوم کے خون سے دور کیا جائے۔ نئی روشنی کا اجرا اس بڑے مقصد کو حاصل کرنے کی ایک چھوٹی سی کوشش ہے۔“

چندن صاحب کا یہ مضمون ان کے عملی انکس اور تحقیقی ژرف نگاہی پر دال ہے۔ اردو صحافت کے سفر میں شامل بیشتر مضامین اردو صحافت کے تاریک یا نیم روشن گوشوں کو منور کرتے ہیں اور اس عمل میں محض جذباتی خروش سے کام نہیں لیا گیا بلکہ مصروفیت اور دیانت داری کی مکمل پاسداری کی گئی ہے۔

کتاب ”اردو صحافت کا سفر“ تاریخ صحافت کا ایک روشن باب ہے جس کے لئے چندن صاحب ہر پہلو کے مستحق ہیں۔



نریش مدیم

”ہندوستانی صحافت کا ارتقاء: 1947ء سے پہلے“

آج جب کہ ہم سب اردو کے معروف صحافی آنجنابی گرچن داس چندن کی 94 ویں سالگرہ پر ان کو یاد کرنے کے لئے یہاں جمع ہوئے ہیں، میں ان کی شخصیت کے ایک ایسے پہلو پر بات کرنا چاہوں گا جو کہ ان کے بچپن اور ان کی ابتدائی جوانی کے دور کا ایک نمایاں پہلو تھا۔ میری مراد اس آئیڈیلزم یا آدرش واد سے ہے جو برطانوی سامراج سے ملک کی نہات کے لئے چلتے والی قومی تحریک کی پیداوار تھا۔ جناب جی ڈی چندن نے جس بے لوث ڈھنگ سے اردو صحافت کے تئیں اپنی امانت پیش کی، اس کا سیدھا تعلق بین اسی آدرش واد سے تھا جس کا مفصل تذکرہ راقم نے کہیں اور کیا ہے۔ ”آج ہمارے چاروں طرف قصب کا جو ماحول پھیلا ہوا ہے، اس میں لازمی اور فطری طور پر کچھ لوگوں کو آئیڈیلزم کی بات کرنا ہی بے معنی لگ سکتا ہے اور کچھ لوگ تو یقیناً اسے ایک ہوائی یا کھوکھلا تصور کرتے ہوں گے، لیکن 1947ء میں برطانوی سامراج سے ہندوستان کی نہات کے بعد جو پہلی پشت پر دان چڑھی، اس نے بھی اجتماعی زندگی کے ہر شعبہ میں اس آئیڈیلزم یعنی آدرش واد کا عملی طور پر دیدار کیا ہے۔ جب ہمارے بہت ہی معمولی تنخواہیں پانے والے استاد بھی تن واپی سے اپنا کام کرتے تھے، ہر وقت طلباء کی بہبود اور ترقی کی فکر کرتے رہتے تھے اور جذباتی ہو کر ہم سے کہا کرتے تھے کہ بچو، خوش نصیب ہو تم لوگ کہ تم نے کبھی کہیں یو مین جیک لہراتے نہیں دیکھا۔ قومی تحریک سے پیدا شدہ اس آدرش واد سے اردو صحافت کی یا بالعموم ہندوستانی صحافت کی دنیا بھی لاسٹر نہیں تھی اور 1952ء میں بنی اظہرین پریس کمیشن نے 1955ء میں جب اپنی رپورٹ پیش کی تو اس میں دو ٹوک ڈھنگ سے یہ بات کہی گئی تھی کہ ”پہلے

ہندوستان پر پریس کے زیادہ تر حصہ کا صرف ایک نصب العین تھا اور وہ نصب العین ملک کی سیاسی آزادی تھا۔ اس دور کے زیادہ تر صحافی وطن پرستی کے پر جوش جذبہ سے متحرک تھے اور اس احساس سے معمور تھے کہ ان کو ایک مشن پورا کرنا ہے اور ایک پیغام لوگوں تک پہنچانا ہے۔

لٹ لہاب یہ کہ آج ہم بھلے ہی ایک ہمہ گیر خطوط اور پانگل پن کے دور میں جی رہے ہوں، لیکن جس آدرش وادہ کی بات ہم کر رہے ہیں وہ کوئی کھوکھلا یا ہوائی تصور نہیں تھا۔ 1857ء سے پہلے بھی اور 1857ء کے دوران بھی اور 1857ء کے بعد بھی لاکھوں لوگوں نے اس تصور سے ہی متحرک ہو کر بے شمار قربانیاں دی ہیں۔ کسی کو اس آدرش وادہ کا خاکہ دیکھنا ہو تو وہ مارچ 1931ء کی کراچی کانگریس میں قبول کی گئی قرارداد کا مطالعہ کر سکتا ہے جسے بجا طور پر ہندوستان کے آئین کا بیلہ پرنٹ کہا جاتا ہے۔ یہاں یہ بات بھی غور طلب ہے کہ جہاں کانگریس کا یہ کراچی اجلاس مہاتما گاندھی کی قیادت میں منعقد ہوا، وہیں مذکورہ قرارداد پر بھگت سنگھ کے سوشلسٹ خیالات کی جہاں صاف طور پر دیکھی جاسکتی ہے۔ اسی سلسلے میں ایک پر لطف بات یہ بھی ہے کہ ”مجموری کا نام مہاتما گاندھی“ کا پر لطف اور مشہور محاورہ اسی کراچی اجلاس سے پیدا ہوا جس کے اقتراح کے صرف چھ دن پہلے بھگت سنگھ، راج گرو اور سکھ دیو نے شہادت کا جام پیا تھا۔ اس مہادہ کی ابتدائی ایک اپنی ہی کہانی ہے، لیکن جس تصور سے متحرک ہو کر بھگت سنگھ اور ان کے ساتھیوں نے برطانوی راج کا مقابلہ کیا اور ہنسنے ہوئے اونچ وادہ کی طرف قدم بڑھائے، اس تصور کو ایک خیالی، ہوائی یا کھوکھلا تصور تصور نہیں کہا جاسکتا۔

بھگت سنگھ کی اس شہادت کے وقت آنجہانی جی ڈی چندن کوئی ساڑھے آٹھ سال کے رہے ہوں گے اور اس جکی عمر میں سن پر بہت ہونے والے کچھ اثرات واقعی دیر پا ثابت ہوتے ہیں۔ یوں تو جناب چندن شروع لاہور کے سول اینڈ فٹری گزٹ سے وابستہ رہے جو کہ ایک سامراج پرست پرچہ ہوا کرتا تھا، لیکن اس مختصر سی نوکری کے بعد انہوں نے ہندوستانی صحافت کی چو بے لوٹ خدمت انجام دی اسے مذکورہ آدرش وادہ کی ہی ایک مثال اور اس کی پیداوار کہا جاسکتا ہے۔

باخواسطہ خراج عقیدت

رہا سوال ہماری جنگ آزادی میں اردو صحافت اور بالعموم ہندوستانی صحافت کے رول کا، تو یہاں ہم 1859ء کی ایک سرکاری رپورٹ کا حوالہ دینا چاہیں گے جسے جناب نٹ راجن کی کتاب History of Indian Journalism سے اخذ کیا گیا ہے۔ اس رپورٹ میں صاف طور پر یہ بات درج کی گئی ہے کہ ”اگر 57-1856ء کے دوران شمالی مغربی صوبہ کے اخباروں کا بغور مطالعہ کیا گیا ہوتا تو بغاوت کا اندازہ لگایا اور اسے روکا جاسکتا تھا۔“

یہاں ایک وضاحت ناگزیر لگتی ہے کیونکہ بعض لوگ شمال مغربی صوبہ کی اصطلاح کو شمال مغربی سرحدی صوبہ سے گنڈھ کر بیٹھتے ہیں جو آج پاکستان کا حصہ ہے اور جسے اب بختون خواہ کہا جاتا ہے۔ اسے ہم اس طرح سے سمجھنے کی کوشش کریں گے، اتر اکھنڈ کے ایک الگ ریاست بنائے جانے کے بعد اتر پردیش کا جو حصہ بچتا ہے اسے پہلے United Provinces یا صوبہ متحدہ کے نام سے یاد کیا جاتا تھا لیکن 1856ء سے پہلے یہ خطہ دو حصوں میں بٹا ہوا تھا۔ اس میں ایک تو اودھ کی نوابی تھی جس پر برطانیہ کا کنٹرول بالواسطہ طور پر تھا اور دوسرا حصہ صوبہ آگرہ کا تھا جو سیدھے سیدھے برطانوی راج کی عمل داری میں تھا اور یہی حصہ جسے مغلیہ دور میں صوبہ آگرہ کہا جاتا تھا، برطانوی دور میں شمال مغربی صوبہ کہلانے لگا کیونکہ برطانوی سامراج نے جب پنجاب کو غصب کیا تو اس کے پہلے یہی شمال مغربی صوبہ ہندوستان میں برطانوی سامراج کی شمالی مغربی چوڑی ہوا کرتا تھا۔ یہ درست ہے کہ پنجاب کو 1849ء میں ہی غصب کر کے برطانوی سامراج کا حصہ بنایا جا چکا تھا، لیکن عام طور پر سڑکوں سے لے کر صوبوں تک کے نام مستعمل عام ہونے کے ناطے اتنی جلد نہیں بدلے اور شمالی مغربی صوبہ کی اصطلاح لگتا ہے 1859ء تک بھی جاری رہی۔ غور طلب ہے کہ آگرہ اور اودھ کے یہ صوبے ہی 1857ء کی بغاوت کے سب سے بڑے مراکز تھے۔ لیکن 1859ء کی سرکاری رپورٹ اگر یہ کہتی ہے کہ اس صوبہ کے اخباروں اور رسالوں کا بغور مطالعہ کیا گیا ہوتا تو بغاوت کو بھانپ کر اسے روکا جاسکتا تھا، تو ہم اپنی طرف سے یہ کہہ سکتے

ہیں کہ یہ ہندوستانی صحافت اور بالخصوص اردو صحافت کو برطانوی سرکار کی طرف سے ناخواسطہ طور پر پیش کی گئی خراج عقیدت تھی کیونکہ تفصیل میں گئے بغیر ہم کہہ سکتے ہیں کہ متحدہ صوبہ آگرہ اور اودھ میں ان دنوں سب سے بڑی تعداد اردو کے اخباروں اور رسالوں کی تھی اور ان کی ایک کافی بڑی اکثریت آزادی وطن کے نصب العین کی مبلغ تھی۔ اس لئے اس بات کو ہم بخوبی سمجھتے ہیں کہ بغاوت کے دوران کیوں شمالی مغربی صوبہ کے زیادہ تر اردو پریس سرکار نے بند کر دیے تھے۔

انتہائی قوانین کی بھرمار

اسی کے ساتھ ہمیں یہ بات بھی یاد رکھنی ہوگی کہ ہمارے یہ صحافی 1857ء کی بغاوت کے بعد سے ہی ایک بہت ہی ناموافق حالات میں کام کر رہے تھے جس کی ایک مثال غدر کے دوران دہلی اردو اخبارات کے مالک اور ایڈیٹر مولوی محمد باقر کی شہادت تھی، ٹھیک اسی طرح جیسے 1858ء میں کوئی چھ درجن ہندوستانیوں کے ساتھ اپنے وقت کے بہت بڑے عالم مولانا امام بخش مسہابی اور ان کے دو بیٹوں کو کوچہ چیلان، دہلی میں قطار میں کھڑا کر کے مجموعی طور پر گولی ماری گئی۔ 1857ء کی بغاوت کے شروع ہوئے ابھی ایک مہینے ہی گزرے تھے کہ گورنر جنرل ان کونسل نے 13 جون 1857ء کے روز ایک قانون جاری کیا جسے اصطلاح عام میں Galling Act یعنی کہ دستور زبان ہندی کا نام حاصل ہوا اور جس کا استعمال سب سے پہلے Friends of India نام کے ایک پریس کے خلاف کیا گیا جس نے پلاسی کی جنگ کی پہلی صدی کے موقع پر ایک مضمون شائع کیا تھا اور اسے حکومت نے ”خطرناک اور اشتعال انگیز“ قرار دیا۔ اگرچہ یہ قانون ایک سال کے اندر ہی مسترد کر دیا گیا، تاہم دوسرے جاہلانہ قوانین کی ایک لائن ہی لگا دی گئی۔ 19ویں صدی کی بات تو جانے دیں 20ویں صدی میں بھی کم سے کم چار قانون ایسے تھے جن کا سید حاسدہ حاتلق اخباروں اور رسالوں کی دنیا سے تھا جب کہ ان کے خلاف بعض دوسرے قانون کے تحت بھی کارروائی کی جاسکتی تھی۔ مثال کے لئے The Foreign Relations Act کے تحت کسی اخبار یا رسالے کے تحت اس کے لئے کارروائی کی جاسکتی تھی کہ اس کی تحریر نے کسی

دوستانہ ملک کے ساتھ برطانوی حکومت کے تعلقات کو بگاڑنے کی کوشش کی ہے۔

اسی طرح The Indian States (Protection) Act کے تحت کسی اخبار یا رسالے کے خلاف یہ الزام عاید کیا جاسکتا تھا کہ اس میں چھپی کسی تحریر سے کسی رجواڑے کی جھپ بگاڑنے کی کوشش کی گئی ہے جب کہ ہمیں یہ پتہ ہے کہ زیادہ تر رجواڑے جاہلانہ اور جارحانہ طریقہ حکومت کے لئے بدنام تھے۔ اپنے ایک مضمون میں راقم نے ایسے کل 14 قوانین کی فہرست پیش کی ہے اگرچہ استبداد کا سلسلہ صرف ان 14 قوانین تک محدود نہیں تھا۔

گرہ زال سربراہ دار

لیکن استبداد کی یہ مار زیادہ تر وہ لوگ جھیل رہے تھے جن کے پاس اس استبداد کو جھیلنے کی معاشی یا سیاسی قوت بہت کم تھی یا تقریباً تھی ہی نہیں۔ اس کی ایک اہم وجہ بھی تھی۔

ہات یہ ہے کہ جب برطانوی حکومت کے توسط سے ہندوستان میں یورپی علوم و فنون، تکنالوجی، سیاسی افکار اور تہذیب و تمدن کا چلن بڑھنے لگا تو یہاں نہ صرف ایک نیا بورژوا طبقہ پیدا ہوا بلکہ ایک نیا درمیانی طبقہ بھی پیدا ہوا جس کے افراد طب، وکالت اور دوسرے جدید پیشوں سے وابستہ تھے۔ انہی میں ایک پیشہ صحافت کا بھی تھا اور جس طرح سے برطانوی دور کا نیچر پہلے کے پنڈت اور مولوی سے مختلف تھا، اسی طرح سے مظاہرہ دور کے وقائع نویس یا اخبار نویس سے 1770ء کے بعد کے صحافی کی بھی کوئی مماثلت نہیں تھی۔ علاوہ اس کے کہ دونوں کے آڈینس Audience میں بھی ایک فرق تھا اور وقائع نویس یا اخبار نویس کے برعکس نیا صحافی کسی بادشاہ یا صوبہ دار کے لئے نہیں بلکہ عوام کے لئے واقعات کو درج کر رہا تھا۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگرچہ 1770ء کے بعد کے دور میں بھی کالی، بھیرس جیسے اور خود ہندوستان کے پہلے پرچہ کا مالک ایڈیٹر آجی بھی ایک چھوٹا موٹا بلیک میلر ہی تھا، لیکن بالخصوص 1857ء کے بعد ہندوستان میں صحافت کا ارتقا اس طرح ہوا کہ آدرش واد کی ایک لہر اس میں سرایت کر گئی جس کا تذکرہ اوپر کیا جا چکا ہے۔ اس کا ایک نتیجہ تو یہ ہوا کہ ہندوستان میں پریس کا فروغ نفاذ انڈیہ کے ایک آلہ کار کے روپ میں

ہوا جس کی قیادت گوئی کارل مارکس نے 1853ء میں ہی اپنے مشہور زمانہ مضمون ”ہندوستان میں برطانوی راج کے ممکنہ نتائج“ میں کی تھی۔ ساتھ ہی ایک بات اور بھی ہوئی۔ 1843ء میں ایک مضمون میں مارکس نے کہا تھا کہ کسی مادی قوت کا مقابلہ یقیناً ایک مادی قوت سے ہی کیا جاسکتا ہے، لیکن جب کوئی خیال عوام کے دلوں کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے تو وہ خود ہی ایک مادی قوت بن جاتا ہے۔ بالخصوص 1857ء کے بعد ہندوستان میں پریس کا فروغ برطانوی سامراج نام کی ایک مادی قوت کے مزید مقابل کے روپ میں ہی ہوا اور وہ بھی ایک ایسے سامراج کے مقابلے جس کے راج میں، بقول محاورہ، کبھی سورج نہیں ڈوبتا تھا۔

لیکن ہندوستانی پریس کے طبقاتی کردار کے متعلق اپنی تحقیق کے دوران راقم کو ایک عجیب و غریب میلان دیکھنے کو ملا، اور وہ میلان یہ تھا کہ 1947ء سے پہلے اس ملک کا سرمایہ دار طبقہ جہاں اپنے مفاد کے لئے FICCI جیسے ادارے قائم کر رہا تھا اور انڈین نیشنل کانگریس کے ذریعہ اپنے مطالبات سامنے رکھ رہا تھا، وہیں وہ اخباروں اور رسالوں میں سرمایہ لگانے سے گریز کر رہا تھا اور یہ کہانی صرف اردو کی نہیں، جو آج کے برعکس ان دنوں بہت بڑی آبادی کے بچے مروج تھی، بلکہ تمام ہندوستانی زبانوں کی تھی۔ اپنے مطالعہ کے دوران راقم کو کل جمہوریتیں ایسی مثالیں دیکھنے کو ملیں جن میں بڑے سرمایہ داروں نے پیسہ لگایا۔ ان میں ایک مثال تو The Hindustan Times کی تھی جو شروع میں اکالیوں کا اخبار تھا مگر پھر برلا گھرانے کے ہاتھوں میں چلا گیا، دوسری مثال Arjun کی تھی جسے گھن شیام داس برلا نے 1922 میں شروع کیا اور جو 1928ء میں Veer Arjun بن گیا اور تیسری مثال Bombay Free Press Journal کی تھی جسے ایس سداوند نے 30 جون 1930ء کو شروع کیا اور جس کے ڈائریکٹروں میں سداوند کے علاوہ پانچ بڑے سرمایہ دار ایم جے کمر، جی ڈی برلا، پرشوتم داس تھا کر داس، سر فیروز سیٹھیا اور وال چند ہیرا چند بھی تھے مگر سرکاری پبلی گزٹی کے بعد چار ڈائریکٹرز اسی پرچہ سے الگ ہو گئے اور دوسری گزٹی کے بعد پانچواں بھی چلا گیا اور پھر سرکاری خطاب کا سامنا کرنے کے لئے سداوند

اکیلے رہ گئے۔ اردو، ہندی وغیرہ میں اس طرح کی سرمایہ کاری کی مثالیں نہیں ملتیں۔

اس کی دو وجہیں سمجھ میں آتی ہیں۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ان دنوں تعلیم اور خواندگی کی شرحیں آج کے مقابلے بہت کم تھیں اور اسی حساب سے اخبار اور رسالے پڑھنے والے بھی کم تھے۔ 1877ء میں سر جارج برڈوڈ (Sir George Birdwood) نے جو تحقیق پیش کیا تھا، اس رو سے پورے ہندوستان میں جس میں آج کے پاکستان اور بنگلہ دیش بھی شامل تھے، مختلف صوبوں اور پریسی ڈسٹریکٹوں میں تمام اخباروں اور رسالوں کے کوئی ایک لاکھ قاری تھے اور یہ کہ کسی پرچے کے زیادہ سے زیادہ 3000 گاہک تھے۔ نیز کوئی آدمی صدی بعد Free Press Journal کی 4000 گاہکوں تک رسی تھیں اور اسے ان دنوں ایک بھاری کامیابی جانا جاتا تھا۔ تاہم یہ بات بھی سچ ہے کہ اس طرح کی سرکولیشن پر کسی کاروبار کی بنیاد نہیں رکھی جاسکتی تھی۔ پریس میں سرمایہ کاری سے گریز کی ایک وجہ یہ بھی تھی۔

لیکن اس کی دوسری اور کہیں زیادہ اہم وجہ سرمایہ دار طبقے کی طبقاتی بزدلی (Class Cowardice) تھی اور یہ طبقہ اگر سامراج سے ٹکراتا بھی تھا تو اس ٹکراؤ کو ایک حد سے آگے بڑھنے نہیں دیتا تھا۔ یاد رہاتی ہوئی میں یہ کہہ لیجئے کہ یہ طبقہ ابھی رو رو کر جیسے بٹا رہا تھا اور جس جس کر اسے لٹانے کی حالت میں نہیں پہنچا تھا۔ اگر گاندھی جی نے اپنی تینوں تحریکوں 1921-22، 1930-32 اور 1942-44 کو ایک مقام پر آکر واپس لے لیا تو اس کا سبب عین اس (Red Anarchy) کا خوف تھا جو پورڈوا طبقہ کی نیند حرام کئے رہتا تھا۔

متوسط طبقے کا رول

ان حالات میں سامراج کے مذہم مقابل کمزری ایک مادی قوت کو فروغ دینے کا فریضہ انہما مہیا متوسط طبقہ نے جو پڑھا لکھا تھا نئے خیالات اور نئے رجحانات سے واقف تھا اور حالات کی بغیر انگلی بھی رکھے ہوئے تھا۔ اس متوسط طبقہ کا ایک چھوٹا سا حصہ بالائی متوسط طبقہ کا تھا جن میں وادہ بھائی نوروجی سے لے کر جواہر لعل نہرو تک کی شخصیات نظر آتی ہیں، لیکن ایک بڑا حصہ ذیلی متوسط

طبقہ کا تھا جس کے نوجوان بڑے شہروں سے لے کر چھوٹے قصبوں تک سے وابستہ تھے۔ ہمارے پڑوسیوں میں نشاۃ الثانیہ کا علم بردار مین کی طبقہ ثابت ہوا۔

لیکن جیسا کہ ہم نے پہلے کہا کہ اس متوسط طبقہ کا ذیلی حصہ وہ تھا جو معاشی قوت اور سیاسی قوت کے اعتبار سے بہت ہی کمزور تھا مگر پھر بھی جو آگے بڑھ کر سامراج سے ٹکرا رہا تھا۔ لیکن دوسری طرف مین کی طبقہ خود کے معاشرہ کی خامیوں اور کمزوریوں پر نظر بھی رکھے ہوئے تھا اور اس کے سبب سماجی اصلاحات اس کی ترجیحات میں شامل تھیں جس کے سبب وہ قدامت پسندوں کے مقابلے میں بھی جھیل رہا تھا۔ یہ بات درست ہے کہ ان دنوں بھی کچھ پرچے قدامت پسندی کے علم بردار تھے، لیکن 1947ء تک کل ماکر گلوب ان پریسوں کا ہی رہا جو معاشرہ اور مذہب دونوں میں اصلاحات کے پیروکار تھے۔ بنگال میں کمیونسٹوں سے لے کر یوپی میں برج ناراین چکھستہ اور مہاراشٹر میں بھکھا بائی کے معاملے مین اسی حقیقت پر روشنی ڈالتے ہیں۔

مختصر یہ کہ یہ ذیلی متوسط طبقہ جو ایک بڑی حد تک وسائل اور لوازمات سے محروم تھا، ایک ہی ساتھ دو دشمنوں سے خارجی اور داخلی دشمنوں سے، برطانوی سامراج اور ملکی قدامت پسندوں سے ٹکرا رہا تھا۔ ایک مثال کے طور پر ایک معمولی کسان گھرانے میں پیدا ہوئے بھگ سنگھ بم اور ہستول کے آدمی نہیں تھے جیسا کہ کچھ لوگ ان کو سمجھتے ہیں بلکہ ان کی سیاسی زندگی کی شروعات بدعنوان اور بد اخلاق برطانوی پرست مہلتوں کے جنگل سے گرو دواروں کو نجات دلانے کے لئے چنے والی اکالی تحریک سے ہوئی تھی جو جلد ہی ”بڑے گرو دوارہ“ یعنی کہ ملک کی نجات کی تحریک میں تبدیل ہو گئی۔ آج کے اکالیوں کو دیکھ کر اس اکالی تحریک کا اندازہ بھی نہیں کیا جاسکتا۔

اوپر ہم نے پہلے کے صحافیوں کے سلسلے میں جس بے لوث خدمت یا میشن موڈ (Mission Mode) کی بات کی ہے اس کا طبقاتی پس منظر یہی ہے کہ سرمایہ دار طبقہ اسی شعبہ میں سرمایہ لگانے سے گریز کر رہا تھا مگر بڑے مالکوں کا متوسط طبقہ اسے ملک و قوم کی خدمت کے ذرائع میں سے ایک اہم ذریعہ کے روپ میں دیکھ رہا تھا۔ اس صورت میں آسانی سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ

کیوں اس دوسرے کے پرچوں میں اشتہار بہت کم ہوتے تھے اور کیوں وہ زیادہ تر مقامی بلدیاتی اداروں پر منحصر رہتے تھے جن میں ہندوستانوں کی تعداد رفتہ رفتہ بڑھ رہی تھی اور جو اخباروں اور رسالوں کی کاپیاں خرید کر اسکولوں اور لائبریریوں میں تقسیم کیا کرتے تھے۔ کچھ قلیل رتی ان کو جاگیرداروں اور راجاؤں وغیرہ سے بھی بطور عطیہ مل جاتی تھی۔

اس دور کے ایک متوسط صحافی کی کیا حالت تھی اس کے بارے میں ہم ایک مثال پیش کرتا چاہیں گے۔ چونکہ مشی پریم چند خود کانپور کے اخبار ”زمانہ“ کے ایڈیٹر رہ چکے تھے، لہذا ان کے شاہکار ناول گودان میں دیک بکلی کے ایڈیٹر پنڈت اونکار ناتھ جو کچھ کہتے ہیں اسے ہم پریم چند کے اپنے مشاہدات پر مشتمل مان سکتے ہیں۔ رائے صاحب کے گاؤں میں ہونے والی ایک تقریب کے دوران پنڈت اونکار ناتھ مس مالنی کو اپنا دکھ سناتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ایک ایڈیٹر کی زندگی ایک طویل نوحہ ہوتی ہے جو کسی کے دل میں ہمہ روزی نہیں چٹکتی بلکہ اسے سننے والا اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ لیتا ہے۔ وہ غریب نہ اپنا بھلا کر سکتا ہے اور نہ اپنے گھر والوں کا۔ اس سے ہر تحریک میں قش قش رہنے کی امید کی جاتی ہے، لٹھی کسانے، نیل جانے اور گھبراہٹ قرق کرانے کی امید کی جاتی ہے مگر اس کی مصیبتوں اور اس کی پریشانیوں پر کسی کی نگاہ نہیں رہتی۔ میراجی کے بارے میں لکھتے ہوئے سعادت حسن منٹو نے یہی بات اپنے مخصوص ڈھنگ سے کہی ہے۔ بقول منٹو، وہ دور ایسا تھا کہ ”شاعر، صحافی اور ایڈیٹر لوگ لاٹری میں نکلے بیٹہ کروڈل ریٹ پر اپنے کپڑے دھو لاتے تھے اور بڑی بکلی کھلی زندگی بسر کرتے تھے۔“ منٹو کا ہی ریلو ڈرامہ ”جولٹ“ جس کے مرکزی کردار منٹو کے اپنے گرو عہدالہاری صاحب تھے، اس دور کے صحافیوں کی تکلیفوں اور عمر میں کو اور بھی تب و تاب کے ساتھ ابھار کر سامنے لاتا ہے۔

اسی دور میں اردو صحافت کا ارتقاء بھی ایسی ہی دشواریوں کے بیچ ہوا۔ مولانا حسرت موہانی اپنے ہاتھ سے پرچے کی کتابت کر کے اسے اپنے ہاتھ سے لٹھو پر چڑھاتے اور خود مشین چلا کر چھاپتے تھے۔ ذمیدار (لاہور) کی سکیورٹی بار بار ضبط ہوتی رہی۔ مولانا ابوالکلام آزاد ہر وقت

ساہوکاروں کے طعنے سنتے رہتے تھے اور مولانا محمد علی جوہر کے گھر میں تو اکثر چلے جاتے تھے۔
 بھی کچھ نہیں ہوتا تھا۔ تاہم ان لوگوں نے ان حالات میں بھی صحافت کی جوت جگائے رکھی۔

1947ء سے پہلے کی ہندوستانی صحافت کے اس طبقاتی کردار سے اس حقیقت کی بھی جڑی
 توضیح ہوتی ہے کہ کیوں اس دور میں روزناموں کی تعداد کافی کم اور ہفت روزوں کی تعداد اسی
 تناسب میں زیادہ ہوتی تھی۔ یوں اس کے پیچھے غالباً یہ سوچ بھی کام کر رہی تھی کہ روزناموں سے
 NEWS کی توسیع ہوتی ہے، Views کی نہیں۔

ایک تحریک کے روپ میں ہندوستانی صحافت کے اس ارتقاء سے یہ بات بھی لگی جاسکتی ہے
 کہ باہمی مقابلوں کے باوجود اس دور کے صحافتوں میں کیوں یکجہتی کا احساس بہت ہی قوی تھا جس
 کے سبب جب سرکار ایک پرچہ بند کرائی تھی یا ایک ایڈیٹر کو جیل بھیجتی تھی تو کیوں یکو ہی دنوں کے
 اندر ایک اور نام سے ایک نیا پرچہ نکل آتا تھا اور کیسے ایک دوسرا بندہ اس کی ادارت کے لئے مستعد
 کھڑا ملتا تھا۔ یہ وہ ترکیب تھی جس کے سہارے ہندوستانی صحافتوں نے اگست 1947ء تک
 برطانوی استبداد کا مقابلہ کیا اور اپنی فرض ادائی کرتے رہے۔ رہا سوال 1947ء کے بعد کا تو وہ
 ایک الگ ہی کہانی ہے جس کے بارے میں پھر کہی۔

حوالہ جات:

- 1- نریش ندیم: Tv Entertain Industry in India: Characteristics, Mainstream and Trends، یکم اگست 2015۔
- 2- گورنمنٹ آف انڈیا: The Report of the Press Commission، نئی دہلی، ہائیڈر پبلیکیشنز ڈسٹری بیوٹرز، 1955ء، ص 482۔
- 3- کراچی کے Daily Gazette کو بعد میں نام بدل کر لاہور کے اسی پرچہ کا کراچی ایڈیشن بنادیا گیا۔
- 4- جے ٹی راجن: History of Indian Journalism، نئی دہلی، ہائیڈر پبلیکیشنز

ڈوئچن، 1955ء، دوسری طباعت: 2000ء، ص 97۔

(یہ کتاب حکومت ہند کی مذکورہ بالا رپورٹ کی دوسری جلد ہے جسے ایک سرکاری فیصلے کے تحت پریس کمیشن کے چیئرمین جناب جے نٹ راجن کے نام سے ایک الگ کتاب کے روپ میں شائع کیا گیا۔)

5۔ فریڈرک ایم: Journalism in the Subcontinent in the First

Half Mainstream of the Twentieth Century 4، اگست 2012

6۔ موہت موہتر: A History of Indian Journalism، کوکنا: نیشنل بک

ایجنسی، 1955ء، ص 161۔

(یہ کتاب صرف 1880ء کی دہائی تک کا ہی احاطہ کرتی ہے کیونکہ اس کی تصنیف کے دوران ہی مصنف کا انتقال ہو گیا۔)



کتابوں کی باتیں

کتاب :	تھمپس پریزیڈنٹ (عوام الناس کے صدر)
مصنف :	جناب ایس۔ ایم۔ خان
پبلشر :	بلوس بری ہیکلیمنز
اشاعت :	2016
مہر :	سید و جاہت منظر

ٹی 116/1، مین ملر کٹ، ملوکھلا گاؤں، جاموہ نگر نئی دہلی، 110025

زیرِ خیرہ کتاب ہندوستان کے میزائل مین، بھارت رتن، سائنسدان، معلم اور سابق صدر ڈاکٹر اے۔ پی۔ جے۔ عہدِ انکلام مرحوم کی زندگی اور کارناموں کا احاطہ کرتی ہے خصوصاً ان کی زندگی کے اس دور کا جب وہ صدر مملکت کے عہدے پر فائز تھے۔ اس کتاب میں ان کے کردار کی ان صفات سے ہمیں روشناس کرانے کی سعی کی گئی ہے جنہوں نے ڈاکٹر کام کو ایک عظیم شخصیت بنادیا۔

کتاب کے مصنف جناب ایس۔ ایم۔ خان بذاتِ خود ایک ایماندار اور منظر المر ارج شخصیت کے حامل ہیں اور حکومت میں اعلیٰ اور حساس عہدوں پر فائز رہے ہیں۔ ان دنوں وہ وزارتِ اطلاعات و نشریات کے محکمہ ہندوستانی اخبارات کے ڈائریکٹر جنرل اور رجسٹرار جنرل کے عہدے پر فائز ہیں۔ اس سے پہلے وہ ڈی ڈی نیوز میں ڈائریکٹر جنرل کی حیثیت سے کام کرتے رہے جہاں انہوں نے دیگر اہم کارکردگیوں کے ساتھ ساتھ باقاعدہ ایک اردو نیوز ڈیسک کا قیام کیا جو اعلیٰ اردو میں ان کی خصوصی مقبولیت کا باعث بنا۔ اس سے قبل وہ سی بی آئی میں بھی اعلیٰ افسر اور چیف ترجمان کے طور پر قومی اور بین الاقوامی میڈیا میں اپنی ایک اہم شناخت بنا چکے تھے۔ وہ حکومتِ ہند کے ڈائریکٹوریٹ آف فلم فیسٹیولس میں ڈائریکٹر جنرل کی حیثیت سے کانس فلم فیسٹیول اور ہانگ کانگ فلم فیسٹیول میں ہندوستانی وفد کی سربراہی کر چکے تھے۔ انہوں نے عزت

تآب صدر ہند کے سرکاری دفو کے اہم رکن کے طور پر ان کے ساتھ کئی ممالک کے دورے کئے تھے۔ سرکاری ملازمت جوائن کرنے سے پہلے وہ اتر پردیش میں ایک وکیل اور قانون کے لکچرار رہ چکے تھے۔ ساج اور ملک و ملت کے کزدر طبقات کی بہبود سے متعلق غیر سرکاری تنظیموں کے کاموں میں بھی وہ بڑی مستعدی سے سرگرم عمل رہتے ہیں۔ عزت تآب صدر ہند ڈاکٹر اے بی جے عہد الکلام کے عہد صدارت کی ابتداء سے انہیں ان کے ساتھ وابستہ رہنے کا شرف حاصل رہا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ نیک طبعی اور ملک و ملت کے تئیں ان دونوں شخصیات میں بڑی جذبہ پائی ہم آہنگی پائی جاتی ہے اور شاید یہی بات اس کتاب کی تصنیف کا باعث رہی ہوگی۔ جیسا کہ آپ ہم سب جانتے ہیں کہ ایس ایم خان صاحب ڈاکٹر اے۔ بی۔ جے۔ عہد الکلام کے عہد صدارت میں راشٹر پتی بھون میں پریس سکریٹری کے فرائض انجام دیتے رہے تھے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ڈاکٹر کلام نے راشٹر پتی بھون کو عوام الناس کا مرکز و محور بنانے کا اپنا موقف شروع ہی میں بڑے واضح انداز میں انہیں بتا دیا تھا اور عہد صدارت کے آخری دن تک وہ اپنے اس موقف پر قائم رہے تھے۔ یہ بات اس کتاب کے تعارف نامے میں شامل ہے۔ راشٹر پتی بھون میں کام کرنے والے ہر شخص کو انہوں نے اپنے آپ کو ”ڈاکٹر کلام“ کہہ کر خطاب کرنے کو کہا تھا اور ”بھائی نہیں“ یا ”مہاشیم“ جیسے القاب و آداب کے استعمال کو ترک کرنے کی ہدایت دی تھی۔ سرکاری تقریبات میں راشٹر پتی کے لئے منجے پر سجاؤ زیادہ بڑی اور بیش قیمت کرسی لگائے جانے کی روایت کو انہوں نے ختم کروا دیا تھا۔ انہوں نے یوم آزادی کے موقع پر رائج پروٹوکال کے برخلاف امر جوان جیوتی جانا شروع کیا۔ خان صاحب رقم طراز ہیں کہ ڈاکٹر کلام نے انسانیت، اخوت، ترقی اور مثبت رویوں کے پیغام کو پھیلانے کے لئے اپنے عہدے اور دفتر کا استعمال کیا۔ وہ کبھی بھی خالی نہیں بیٹھتے تھے۔ ہمیشہ کام میں مشغول رہنے والے ڈاکٹر کلام وقت کے بڑے پابند تھے۔ جب بھی انہیں خالی وقت ملتا تو وہ دینا بجانے لگتے تھے یا شاعری کی تخلیق میں مصروف ہو جاتے تھے۔ ڈاکٹر کلام ایک مخیل پرست تھے۔ انہوں نے راشٹر پتی بھون میں ای۔ گورنمنس کی شروعات کی تھی۔ یہ بھی ڈاکٹر کلام کی

حساس طبیعی کا مظہر امر ہے کہ نئی دہلی سے باہر انہوں نے اپنے پہلے سرکاری دورے میں گجرات جا کر 2001 کے زلزلے اور 2002 کے فرقہ وارانہ فسادات سے متاثرہ لوگوں سے ملاقات کا فیصلہ کیا تھا۔ اس کے بعد وہ بھوپال گئے تھے اور وہاں بھوپال گیس ٹرینجیڈی سے متاثرہ عوام سے بھی ملے تھے۔ 13 ابواب میں منقسم یہ کتاب ڈاکٹر کلام کے کردار کی بھرپور تصویر کشی کرتی ہے۔ ”مین آف کریج“ عنوان سے کتاب میں شامل باب میں خان صاحب نے تذکرہ کیا ہے کہ کیسے روڈنی کالیں۔ ایل۔ وی۔ ایل کے مدار میں قیام کے مشن سے ڈاکٹر کلام ناخوش تھے جو کہ ناکام رہا تھا اور اسی کے کچھ عرصہ بعد کیسے وہ پکھرن ۱۱ کے کامیاب نیوکلیئر تجربے کے روح رواں بنے۔

ڈاکٹر اے۔ پی۔ جے۔ عبدالکلام ملک کے ایک مایہ ناز صدر رہے ہیں کہ جن کی رسائی ایک چھوٹے بچے سے لے کر کئی صدر مملکت کے ساتھ ہر آسانی ممکن تھی۔ وہ ایک ایسے عوامی دانشور تھے جو آخری صف میں بیٹھا ہوئے آدمی سے لے کر اعلیٰ سطح کے سائنسدان تک سبھی کی توجہ کا محور بن جاتے تھے۔ اگر کوئی یہ خیال کرے کہ وہ محض ہندوؤں اور اعداد و شمار کے ماہر تھے تو وہ اپنے فنی موسیقی اور روحانیت کے علم سے لوگوں کو حیران کر دیتے تھے۔ ان کے لئے راشٹر پتی بھون آرام کرنے اور ماضی کے کارہائے نمایاں کا شمار کرنے کی جگہ نہیں تھی۔ بلکہ انہوں نے اس اعلیٰ مرتبت جگہ کو ملک بھر میں اپنے ”2020 تک ترقی یافتہ ہندوستان کے خواب“ کو عوام تک پہنچانے کا وسیلہ بنایا تھا۔ ہم اس تاریخ کے قریب تر ہیں اور اب بھی بہت سی کہانیاں ہمیں پڑنا باقی ہیں۔ اس لئے اس عرصے میں دنیاوی نقطہ نظر سے ہمیں ایسا محسوس ہونے لگا ہے کہ ڈاکٹر کلام ایک ایسے آدرش والدی تھے، جو ہندوستانی۔ ہست کے عملی پہلو کو نہیں سمجھ سکے تھے۔ حالانکہ ڈاکٹر کلام کی زندگی اور عصر حاضر پر حال ہی میں مظہر عام پر آنے والی یہ کتاب ان مسائل پر ان سے متعلق ہمیں اپنے محسوسات اور رائےوں کا از سر نو تجزیہ کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ ”غولس پر پڑیلے پٹ“ نامی کتاب جو ایل۔ ایم خان صاحب نے تصدیق تحریر کی ہے اور جسے بلوسمری ویلیکیٹینو نے شائع کیا ہے، ڈاکٹر کلام کی زندگی کے سنجائے معلوم پہلوؤں کے لئے نہ صرف ایک درجہ وا کرتی ہے بلکہ

ان کے کچھ فیصلوں کو صحیح قرار دیا کرتی ہے۔ خاں صاحب ڈاکٹر کلام کے پریس سیکرٹری رہے تھے اور آئرنک وہ ان کے ساتھ رابطے میں تھے۔ "پانچ سال تک میں ڈاکٹر کلام کے عہد صدارت میں ان سے بہت قریب رہا تھا اور بعد میں بھی۔ ان کی رحلت سے تین دن پہلے میری ان سے آخری ملاقات ہوئی تھی۔ ان کی وفات کے بعد ہی سے میں ان پر ایک کتاب لکھنے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ 15 اگست 2015 کو راجستھانی بھون کی ایک تقریب کے دوران میں وزیر اعظم نریندر مودی سے ملا۔ انہوں نے بھی مجھے ڈاکٹر کلام پر کچھ لکھنے کی ترغیب دی۔" یہ بات خود ایس۔ ایم خان صاحب نے بتائی ہے جو ان دنوں ہندوستان کے وزارت اطلاعات و نشریات کے تحت اخباروں کے رجسٹرار جنرل کے عہدے پر فائز ہیں۔ موصوف کا کہنا ہے کہ ڈاکٹر کلام کی باتیں مذہب، ذات، فرقہ اور علاقہ کے حدود سے بالاتر ہوتی تھیں۔ ہزاروں کی تعداد میں لوگ ان کا خیر مقدم کرنے کے لئے سڑکوں پر جمع ہو جاتے تھے۔ ایسا مجمع عام طور پر اعلیٰ ترین سیاسی سربراہوں کے ہی حصے میں آیا کرتا ہے۔ اس سب سے اعلیٰ سیاست کے ایک حلقے میں ان کے تئیں رقابت کا جذبہ پیدا ہو گیا تھا اور ان کی ہر دلعزیزی ہی ان کے دوسرے دور کے لئے مائع اسباب میں سے ایک بنی۔ خان صاحب مزید بتاتے ہیں کہ "ڈاکٹر کلام میں ایک کی تھی۔ وہ نہ عوامی مقبولیت کے معاملے میں وہ مہاتما گاندھی کے ہم پلہ ہو سکتے تھے۔ وہ ہندی اور اردو نہیں جانتے تھے۔ وہ حقیقت مجھے حیرانی ہوئی کہ انہوں نے بول چال کی ہندوستانی بھی نہیں سیکھی۔" خان صاحب یہ کہ وقت ہندی و اردو سامعین کے لئے ان کی تقریروں کا ترجمہ بھی کیا کرتے تھے۔ "ایک دفعہ بنگالی کے اسٹیڈیم میں ہزار ہا لوگوں کے سامنے ڈاکٹر کلام نے پہلے ملائم سنگھ یادو کو اپنے آبائی گاؤں کی ترقی و بہبود کے کام کرنے کی ترغیب کی اور اس کے بعد انہوں نے مشورہ دیا کہ پردیش کے دوسرے گاؤں کے لئے بھی انہیں برابر سے کام کرنا چاہئے۔ اس بات کو مجھے ہندی میں ترسیل کرنا تھا۔"

یہ بات بھی بڑی دلچسپ ہے کہ وہ ملائم سنگھ یادو ہی تھے کہ جنہوں نے ڈاکٹر کلام کو چند جملے ہندی زبان میں سکھائے اس وقت جب کہ وہ وزیر دفاع تھے۔

ڈاکٹر کلام کی صدارت کے دوسرے مدت کار میں دلچسپی سے متعلق ایس۔ ایم۔ خان ماننے ہیں کہ ذرائع ابلاغ کے ایک حلقے میں صرف ایک ہی مرتبہ ان پر تنقید ہوئی تھی کہ وہ دوسری میعاد کار کے امکان پر کیوں غور و غوص کر رہے تھے۔ خان صاحب بڑے وثوق کے ساتھ کہتے ہیں کہ انہیں دوسری مدت کار میں کوئی دلچسپی نہیں تھی اور وہ درس و تدریس اختیار کرنے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ لیکن حسب مخالف کے چند لیڈروں نے ان پر زور دیا کہ اگر وہ صدارت کے عہدے پر دوسری میعاد حاصل کر لیں تو اپنے 2020 کے ترقی یافتہ ہندوستان کے خواب کو عملی جامہ پہنانے کے نقطہ نظر سے یہ ملک کے حق میں بہتر ہو گا۔ کلام صاحب نے کہا تھا کہ وہ ایسا تب ہی کرنا پسند کریں گے جب یہ بات حتمی طور پر طے ہو یا ان کے حق میں اکثریت کی حمایت حاصل ہو۔ اس لئے جب بہوجن سانج پارٹی نے کانگریس کے امیدوار کی حمایت کرنے کا فیصلہ کر لیا تو خود میں نے ان سے کہا کہ اتفاق رائے بننے یا جیتنے کا کوئی موقع نہیں بچا ہے۔ اس درمیان بقول خان صاحب اس وقت کے وزیر اعظم ڈاکٹر منموہن سنگھ نے بھی صدر جمہوریہ سے خصوصی ملاقات کی اور مقابلہ نہ کرنے کا مشورہ دیا، بصورت دیگر برسر اقتدار جماعت کے لئے بہت مشکل ہوگی۔ ڈاکٹر کلام قحطل کی فضا پیدا کرنا نہیں چاہتے تھے۔ لیکن بات ان کے قانونی اور آئینی مسائل حل کرنے میں بھی ظاہر ہوا کرتی تھی۔ وہ پہلے صدر جمہوریہ تھے جنہوں نے آئین کی دفعہ 111 کے تحت ایک بل پارلیمنٹ کو از سر نو غور کرنے کے لئے واپس بھیج دیا تھا۔ یہ بات ایس۔ ایم۔ خان صاحب نے آفس آف پرافٹ بل کے حوالے سے بتائی۔ وہ اس بل کو اپنے پاس ہی التوا میں رکھ سکتے تھے جیسا کہ گیمانی ذیل سنگھ نے پوسٹ آفس (ترمیم) بل کے ساتھ کیا تھا وہ تازہ ہند نہیں کرتے تھے لیکن اسی کے ساتھ وہ اپنا منہ نظر واضح رکھنا چاہتے تھے۔ اسی طرح انہوں نے فینلس ایکٹ 1951 کی نمائندگی میں ترمیم سے متعلق مسودے کو منظوری دینے سے انکار کر دیا تھا۔ چند سیاسی رہنماؤں نے ان کی تنقید کی تھی لیکن سپریم کورٹ نے اسے رد کرنے کا اعلان کر دیا تھا اور اس طرح ڈاکٹر کلام کے پبلک زندگی میں مکمل شفافیت کے رویے ہی کو حمایت ملی تھی۔ خان صاحب کے

مطابق ڈاکٹر کلام کے سامنے دوہری مشکل کا وقت فروری 2005 میں درپیش آیا جب انہوں نے کابینہ کے مشورے پر بہار اسمبلی کو تحلیل کرنے کے سرکاری اعلامیہ پر دستخط کر دیے تھے۔ جب سپریم کورٹ نے اس سرکاری احکام کو غیر آئینی قرار دیا تو ڈاکٹر کلام نے اپنے عہدے سے ہٹنے کی پیشکش کی تھی۔ ”انہیں یہ قائل کرنا بڑا دشوار گزار تھا کہ وہ غلطی پر نہیں تھے دستاویز پر دستخط کرنے کے وقت وہ ماسکو میں تھے اور کسی دوسری پارٹی نے متضاد نظریہ پیش کرنے کے لئے ان سے رجوع نہیں کیا تھا۔ ان کے پاس صرف گورنری سفارش آئی تھی اور دو حمان سبھا پہلے ہی سے معطل حالت میں تھی۔“

لوگ یہ بھولنے لگے ہیں کہ ان کی ایک آدرش استاد کے تشخص سے پہلے ڈاکٹر کلام نے پوکھرانہ کے نیوکلیم تجربہ میں اپنا کلیدی کردار ادا کیا تھا۔ جہاں ان کی میجر جنرل پرتھوی راج شاستی قائم ہوئی تھی۔ خان صاحب نے ڈاکٹر کلام کی شخصیت کے اس رخ کو ”مین آف گریٹنگ“ کے عنوان سے کتاب کے ایک باب میں شامل کیا ہے۔ اس باب میں سابق وزیر اعظم پی۔ وی۔ نرسہا راؤ کی سیاسی فراست پر بھی تبصرہ کیا گیا ہے۔ مئی 1996 کے عام انتخابات میں ہار کے بعد راؤ نے ڈاکٹر کلام کو جو کہ اس وقت پرنسپل سائیکھلنگ ایڈوائزر تھے، معین وزیر اعظم اٹل بھاری دلائی کی کے سامنے نیوکلیم پروگرام کے بارے میں جانکاری دینے کے لئے بلایا تھا۔ یہ عمل امریکن صدارتی نظام میں نیوکلیمز کو متعارف کرنے کے مماثل تھا۔ خان صاحب کا کہنا ہے کہ اس بات میں سیاسی تدبیر کی چنگنی ظاہر ہوتی ہے جو ملک کو سیاسی نظام سے بڑھ کر مانتا تھا۔ ملک کو مزید دو سال سے زیادہ عرصہ تک انتظار کرنا پڑا۔ دلائی کی اکثریت کے ساتھ واپسی ہوئی۔ اس عرصے میں ڈاکٹر کلام نے ان کے ساتھ یہ راز محفوظ رکھا۔

اپنی سماجی اور مذہبی شاشت سے اوپر اٹھنے کے باوصف ڈاکٹر کلام کو کچھ آہرو باشت لوگوں کو سہنا پڑا جنہیں ان کے عقیدہ و ایمان پر شک تھا۔ خان صاحب کا کہنا ہے کہ ڈاکٹر کلام ایک سچے مسلمان کی زندگی بسر کرتے تھے اور ساتھ ہی دوسرے مذاہب کا بھی بڑا احترام کرتے تھے۔ ان کا ایمان تھا کہ آدمی کی سب سے بڑی خصوصیت انسان ہونا ہے۔ ”وہ ہر روز نماز پڑھتے تھے لیکن بھگوت گیتا کا

بھی مطالعہ کرتے تھے۔ ان کا ویٹا بھانے سے مذہب کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ ان کے لئے مذہب ایک ذاتی معاملہ تھا اور وہ اس بات پر زور دیتے تھے کہ مذہب کو دکھاوے کی چیز نہیں بنانا چاہئے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ سماج کے ساتھ برتاؤ میں ہمیں انسانیت پرست ہونا چاہئے۔ "ڈاکٹر کلام اکثر اپنے استاد محترم وکرم سارا بھائی کا قصہ بیان کیا کرتے تھے کہ جنہوں نے سائنٹیفک ریسرچ کے لئے ایک بار چرچ کی زمین کا مطالبہ کیا تھا جو انہیں مل گئی تھی کیونکہ چرچ کا یقین تھا کہ سائنس اور روحانیت دونوں ہی انسانی فلاح و بہبود کے معاملے میں خدائے بزرگ و برتر کی رحمتوں کے مہمان منت ہیں۔ خوشونت سنگھ نے ایک بار لکھا تھا کہ "کوئی بھی حقیقت پسند ڈاکٹر کلام کے الوہیت کے تصور سے اختلاف رائے نہیں کر سکتا۔ کچھ لوگ خدا کو حقیقت مانتے ہیں اور کچھ اسے محبت۔ کلام کا الوہیت کا تصور مہربانی کا ہے۔" اور یہی چیز آج ہماری ضرورت ہے۔

کتاب کے سب سے دلچسپ باب کا عنوان ہے "عوام کے راسخ بیتی" ہے، جو کتاب کا ناکھل بھی ہے اور جسے سلیس اردو میں "عوام الناس کے صدور" کہہ سکتے ہیں۔ اس باب میں صدر محترم کی بے مثال کارکردگیوں کا چہ چہ ہے۔ "بچوں کے ساتھ ان کی براہ راست وابستگی ان کا قومی سالمیت کا تصور ان کی سادگی اور انسانیت نے انہیں ایک نسل کے لئے ایک قد آور رہنما اور ہیرو بنا دیا۔" ہندوستان کے میزائل مین اور خلائی سائنس دان کے تصور کے ساتھ ساتھ ہی نسل کی آنکھوں میں ان کی جادوئی شخصیت کے تئیں عجیب نوعیت کا پیار تھا جسے سمجھنا تفہیم سے پرے ہے۔ خان صاحب نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ کلام کتنے منفرد اور منکسر المزاج تھے۔ بہار کے اپنے دور سے کے درمیان وہ ایک دس سالہ اسکول جانے والی بچی سے ملے دوسرے دن انہوں نے ایک فوٹو دیکھا کہ ایک اور بچی جو صدر جمہوریہ سے منسلک ہونے کی وجہ سے رو رہی تھی تو انہوں نے سرکاری محلے سے اس لڑکی کا چہ حاصل کرنے کا حکم دیا اور اسے اپنی تک خواہشات کے ساتھ دھوکہ دیا ہوا خط بھیجا تھا۔ ڈاکٹر کلام نے ہمیشہ آسانی سے سمجھ میں آنے والے پیغامات دئے اور ترقی کی سیاست اختیار کرنے کی ترقیب دی۔

کتاب میں شامل 13 ابواب کے عنوانات کچھ اس طرح ہیں۔ (1) ریشتر جی بھون میں ڈاکٹر کلام کے ابتدائی دن، (2) اندرون ملک دورے، (3) سرود باہمت، (4) قانونی و آئینی مسائل، (5) عوام الناس کے صدر، (6) انسان دوست، (7) پارلیمانی اراکین کے ساتھ مکالمے، (8) بچوں سے محبت: طالب علموں کے لئے ایک مثالی شخصیت، (9) لوک سبھا انتخابات 2004 اور اس کے سیاسی مضمرات، (10) دوسری مدت کار کی پیشکش، (11) وطن کی خیر سگالی کے بین الاقوامی سفیر (الف) بیرونی ممالک کے دورے، (ب) غیر ملکی سربراہان مملکت کی ہندوستان آمد پر صدر جمہوریہ ہند کے ساتھ گفتگو، (12) ڈاکٹر کلام اور ذرائع ابلاغ، (13) عہدہ صدر ملت۔

مختصراً یہ کہ جناب ایس۔ ایم۔ خان کی دستاویزی اہمیت کی حامل، انگریزی زبان میں لکھی گئی کتاب، ”قچملس پر یزیلینٹ“ (عوام الناس کے صدر) نہ صرف جدید ہند کی اس عظیم الشان شخصیت کی زندگی اور افکار کا اچھا و سچا پر ثمر پیش کرتی ہے بلکہ خان صاحب کے اپنے معروضی لب و لہجے مدلل و عالمانہ اور راست انداز بیان، نگارش اور موثر بیانیہ اظہار کی غماض ہے۔ اسے اہم موضوع پر ضمیمہ تحریر کی گئی اس کتاب کا ترجمہ اردو زبان میں جلد از جلد منظر عام پر آنا چاہئے۔ لہذا جناب ایس ایم خان صاحب سے میرے والد محترم ڈاکٹر مظہر محمود نے جب عرض کیا کہ کیوں نہ آپ اس کتاب کو اردو میں بھی لکھیں تاکہ اہل اردو بھی اس یکتا و یگانہ روزگار سعی سے خاطر خواہ واقف ہو سکیں تو انہیں یہ خیال پسند آیا مگر انتہائی مصروفیات کے باعث وہ خود یہ کام نہیں کر سکتے تھے۔ لہذا ترجمے کے فرائض خود اس ناچیز کو تفویض کر دیے گئے، جس کا پہلا ڈرافٹ تا وقت مکمل ہو چکا ہے اس اردو مسودے کے 13 ابواب کے عنوانات اوپر بیان کئے جا چکے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ نظر ثانی کے بعد اس کی اشاعت جلد ہی عمل میں آئے گی اور انشاء اللہ یہ کتاب سال رواں ہی میں اہل اردو کے ہاتھوں کی زینت بنے گی اور ملک و ملت کی آئندہ نسلوں کے لئے رہنما ثابت ہوگی۔



غالب اکیڈمی کی ادبی سرگرمیاں

27 دسمبر 2016 کو غالب کے 219 ویں یوم ولادت کے موقع پر خصوصی لیکچر کا انعقاد:

مرزا اسد اللہ خاں غالب کے 219 یوم ولادت کے موقع پر غالب اکیڈمی بہشتی حضرت نظام الدین، نئی دہلی میں ایک تقریب کا انعقاد کیا گیا اور غالب کے حرار پر گل پوشی کی گئی۔ اس موقع پر ہندی کے مشہور ادیب پروفیسر دھونا تھوڑپانھی نے اپنے لیکچر ”غالب ہندی ادیب کی نظر میں“ میں کہا کہ غالب ہندی والوں کو پریشان کرنے لگے ہیں۔ ہندی میں کوئی ایسا ادیب نہیں ہوگا جس نے غالب کے دس پندرہ شعر نہ یاد کیے ہوں۔ غالب واحد تخلیق کار ہیں جو اپنی زبان کے سب سے بڑے مثر نگار ہیں اور سب سے بڑے شاعر ہیں۔ بالکی بھی مسکرت کے بڑے شاعر نہ ہوتے اگر ان کے پیچھے ویڈیو کی روایت نہ ہوتی۔ انھوں نے اپنی تقریر میں کہا کہ ہندی اور اردو فعل ہے سے نہ ہونے کا تصور پیدا ہوتا ہے۔

اس موقع پر پروفیسر انور پاشا نے اپنی تقریر میں کہا کہ غالب کی شاعری کو مقبول بنانے میں عبوری دور کا مرکزی کردار رہا ہے۔ پروفیسر انور پاشا نے غالب کے اردو دیوان سے مختلف نو کے اشعار پیش کرتے ہوئے کہا کہ غالب نے اپنے فارسی دیوان کو رنگارنگ بنایا تھا لیکن ان کا اردو دیوان بھی رنگارنگ ہے اور اس کی عظمت اشعار کے ہر قلمی ہونے کی وجہ سے ہے۔ انیسویں صدی کے ہیں منظر میں غالب کی شخصیت اور شاعری پر روشنی ڈالتے ہوئے انھوں نے کہا کہ غالب واحد شاعر ہے جو مستقبل کا استقبال کرتا ہے۔

اس موقع پر آئی سی سی آر کے ڈائریکٹر سید محمود اختر نے کہا کہ غالب کے یہاں ہر طرح کے اشعار مل جاتے ہیں۔ اسے ہم ڈیڈ میس کے لیے بھی استعمال کر سکتے ہیں۔ تہذیبی لین دین کے طور

پر غالب کی غزلیں دوسرے ممالک میں کام آتی ہیں۔

اس موقع پر پروفیسر شمیم حق نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ غالب کے برابر ہندوستانی زبانوں میں کوئی شاعر نہیں ہے۔ اس کا مقابلہ مغربی زبانوں کے بڑے شاعروں سے ہو سکتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ غالب بڑے پیچھے ہوئے بزرگ لگتے ہیں ہر سال جب ہم ہزار غالب پر گل پٹی کرتے ہیں تو ایسا لگتا ہے کہ غالب زندہ ہیں۔ مولوی اور دند یکساں طور پر غالب کے قائل تھے۔ ایسا لگتا ہے کہ غالب مراہی نہیں اسے ہم زندہ شخصیت کے طور پر دیکھتے ہیں۔ جیلے کے بعد مدعو جتا بوس نے غالب کی غزلیں موسیقی کے ساتھ پیش کیں۔

15 دسمبر 2017ء کو غالب کے 148 ویں وفات کے موقع پر طلباء کی غزل سرائی:

مرزا اسد اللہ خاں غالب کے 148 ویں یوم وفات کے موقع پر غالب اکیڈمی، نئی دہلی میں سکندری اسکول اور سینٹر سکندری اسکول کے طلباء کی غزل سرائی کے مقابلے کا انعقاد کیا گیا۔ جس میں ڈی پی ایس آر۔ کے چورم۔ اینگلو مرک اسکول، زینت محل جعفر آباد، ڈاکٹر ذاکر حسین میموریل اسکول، فتح پوری مسلم سینٹر سکندری اسکول خدیجہ انگلبرنی اور کیمبرج اسکول اندرا پورم کے طلباء نے حصہ لیا اور غالب کی غزلیں پیش کیں۔ اس مقابلے میں اول، دوم، سوم آنے والے طلباء کو تین ہزار ڈھائی ہزار اور دو ہزار روپے کے انعامات دیے گئے۔ سکندری اسکول کے طلباء میں لڑھٹیا اول، انصیا دوم اور غصہ نے سوم پوزیشن حاصل کی۔ کرن، ولی اور نہال نے حوصلہ افزائی کا انعام حاصل کیا۔ سینٹر سکندری اسکول کے طلباء میں فائزہ اول، عبدالرحمن دوم اور حسان سوم پوزیشن حاصل کی اور علیہ زیدی نے حوصلہ افزائی کا انعام حاصل کیا۔

ڈاکٹر شبانہ نظیرہ شمیم مہاسی اور ابو ظہیر ربانی نے جج کے فرائض انجام دیے۔ جناب جاوید نسیم خاتون غالب اکیڈمی نے انعامات تقسیم کئے۔ اس موقع پر ڈاکٹر شبانہ نظیرہ نے کہا کہ ہم سب کو زندگی میں متحرک و فعال رہنا چاہیے۔ مقابلہ میں حصہ لیتا بڑی ہمت کا کام ہے۔ جن بچوں نے غالب کا

کلام پڑھا بڑی تیاری کی تھی بہت اچھا لگا۔ بچوں نے شاعری کی روح کو قائم رکھا۔ جب ہم مقابلے میں آتے ہیں تو کلام کے انتخاب اور لواٹگی کا خیال رکھنا پڑتا ہے کچھ بچوں نے روش سے ہٹ کر کلام کا انتخاب کیا ان کی پیشکش اچھی تھی۔ اس طرح کا پروگرام مستقل ہونا چاہیے۔

22 فروری 2017 کو غالب اکیڈمی کے 48 ویں یوم تاسیس اور غالب کے 148 ویں یوم وفات کے موقع پر طرہی مشاعرے کا انعقاد:

مرزا غالب کے 148 ویں یوم وفات اور غالب اکیڈمی کے 48 ویں یوم تاسیس کی مناسبت سے غالب اکیڈمی کی چہار روزہ تقریبات کا آغاز طرہی مشاعرے سے ہوا۔ اس موقع پر سرکریٹری غالب اکیڈمی نے خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ غالب اکیڈمی کا افتتاح 22 فروری 1969 کو اس وقت کے صدر جمہوریہ ہندو اکشڑا کر حسین نے کیا تھا۔ 48 سال سے غالب اکیڈمی میں ادبی و ثقافتی تقریبات کا اہتمام کیا جا رہا ہے۔ مشاعرے کی صدارت بزرگ شاعر جناب گلزار دہلوی نے کی اور نقامت مصین شاداب نے کی۔ طرح کے تین مصرعے (1) محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا (2) کبھی تنگی بھی اس کے جی میں گر آجائے ہے مجھ سے (3) دل مرا سوز نہاں سے بے محابا جل گیا۔ ان تین طرحوں میں دہلی کے معروف و مشہور شعرا نے اپنا کلام پیش کیا۔

24 فروری 2017 کو غالب کے 148 ویں یوم وفات اور غالب اکیڈمی کے 48 ویں یوم تاسیس کے موقع پر داستان گوئی کا انعقاد:

غالب اکیڈمی کی چہار روزہ تقریبات کے دوسرے دن داستان گوئی کا انعقاد کیا گیا۔ ایضاً علی اور عثمان صدیقی نے غالب کی زندگی پر مبنی داستان پیش کی۔ غالب کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو بڑے دلچسپ انداز میں پیش کیا۔ جس میں غالب کا تعارف، خاندان، شادی، قلمی تک رسائی، کلکتہ کا سفر 1857 میں دہلی کی برہادی اور وفات تک کے واقعات کو پیش کیا گیا۔ داستان میں غالب کے

خطوط اور اشعار اور لطائف کو پیش کر کے دلچسپی قائم رکھی گئی جس سے سامعین خوب محظوظ ہوئے۔

25 فروری 2017 کو غالب کے 148 ویں یوم وفات اور غالب اکیڈمی کے 48 ویں یوم تاسیس کے موقع پر محفل کلام غالب کا انعقاد:

غالب اکیڈمی میں بروز ہفتہ 25 فروری 2017 کو ایک شاعر محفل کلام غالب کا انعقاد کیا گیا۔ جس میں استاد اقبال احمد خاں اور ان کے شاگرد نے کلام غالب پیش کیا۔ کلام کا آغاز انجوشرما نے غالب کی مشہور غزل ”آہ کو چاہیے اک مہراث ہونے تک“ سے کیا، آشتیوشرما نے ”نہ گل نغمہ ہوں نہ پردہ ساز“ بھادناگوئل نے ”دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں“ اور استاد انیس احمد خاں نے ”دروشت کش روانہ ہوا“ پیش کیں، پھر استاد اقبال احمد نے غالب کی غزلیں پیش کر کے سامعین کو محظوظ کیا۔

26 فروری 2017 کو غالب کے 148 ویں یوم وفات اور غالب اکیڈمی کے 48 ویں یوم تاسیس کے موقع پر سیمینار کا انعقاد:

غالب اکیڈمی میں چہار روزہ پروگرام کے تحت آخری دن ایک سیمینار کا انعقاد کیا گیا۔ جس میں پہلا اجلاس غالب شناسوں اور غالب اکیڈمی سے متعلق مرعومین کے لیے مختص تھا۔ پہلے اجلاس کی صدارت پروفیسر قاضی انضالی حسین اور ڈاکٹر جی آر کنول نے کی۔ ڈاکٹر جی آر کنول نے اس موقع پر کہا کہ جب تک کائنات ہے اور غالب کا دیوان ہے وہ انسانیت کے لیے کافی ہے۔ پروفیسر قاضی انضالی حسین نے کہا کہ غالب جیسا ہم جہت شاعر اور کوئی نہیں ہے۔ غالب دو مختلف جہتوں میں کام کرتا ہے۔ پروفیسر شمیم حق نے خواجہ حسن جانی ٹکائی پر بڑے چڑھتے ہوئے کہا کہ بارہارا اجڑا اور ہستا دلی کی تقدیر رہی ہے۔ دلی میں سب سے پرانی تہذیب کا مرکز خواجہ صاحب کا گھر تھا جس نے تہذیبی اور ثقافتی روایت کو قائم رکھا۔ پروفیسر شریف حسین قاسمی نے ڈاکٹر خلیق انجم

کی ہمد جہت شخصیت پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ یہ کم لوگ جانتے ہیں کہ خلیق انجم صاحب نے ہا قاعدہ انٹیشن لڑا تھا۔ خطوط غالب کی ترتیب میں انھوں نے بڑی محنت کی تھی۔ ان کے خطوط کے مجموعے سے غالب کے خطوط کے دوسرے متون کا بھی اندازہ ہوا اور یہ ظاہر ہوا کہ خلیق انجم کے مرتبہ خطوط میں غلطیاں نہ کے برابر ہیں۔ ڈاکٹر حنا آفرین نے عمور احمد علوی کی غالب شناسی پر مقالہ چڑھتے ہوئے کہا کہ عمور احمد علوی نے نہ صرف غالب کی فارسی کتاب شیخ آہنگ کا اردو ترجمہ کیا بلکہ غالب کی فارسی شاعری پر بھی کتاب لکھی اور فارسی خطوط کی روشنی میں غالب کی سوانح مرتب کی اس سے ان کا شمار ماہرین غالبیات میں ہو جاتا ہے۔ شفیق ایوب نے کمال احمد صدیقی کی غالب شناسی کے عنوان سے مقالہ چڑھتے ہوئے کہا کہ کمال احمد صدیقی کی کتاب میں بیاض غالب تحقیقی جائزہ اور غالب کی شناخت غالبیات کے باب میں اضافہ رکھتی ہیں۔ جناب وپیک بدکی نے جوگندر پال کی تحقیقی کائنات کے عنوان سے پرچہ چڑھتے ہوئے کہا کہ جوگندر پال کی تحقیقی کائنات بہت وسیع ہے انھوں نے اپنے المانوس، افسانوں اور ناولوں میں انسانی زندگی کی گونا گوں تصویریں دیکھ کر شناسی سے غش کی ہیں۔ اس کے علاوہ اردو کو ایک اسٹائل اور ڈکشن دے دیا۔ جناب نذر کشور و کرم دیوٹی سرن شرما کی ڈرامہ نگاری پر مقالہ چڑھتے ہوئے کہا کہ انھوں نے ٹی وی ریڈیو کے ساتھ ساتھ قلمی نیز پر توجہ دی اور دہلی میں غیر پیشہ ور شوقیہ قلمی نگار کی بنیاد رکھی پھر کلاسک سادھنا کے نام سے قلمی گروپ کی بنیاد رکھی۔ اس اجلاس میں سرور الہدیٰ نے ڈاکٹر احمد فاروقی پر اور خالد علوی نے غالب فنکاروں کے حوالے سے گفتگو کی۔ پہلے اجلاس کی خلاصہ ابوظہیر ربانی نے کی۔

سیمینار کا دوسرا اجلاس غالب پر شخص تھا جس کی صدارت پروفیسر قاضی جمال حسین اور پروفیسر وہاب الدین علوی نے کی۔ جامعہ کے ریسرچ اسکالر قاتب فریدی نے غالب اور شاد عظیم آبادی پر پرچہ چڑھتے ہوئے کہا کہ غالب اور شاد دونوں کے یہاں قصوں کے فرق کے ساتھ شعر کا مضمون بہت مماثل ہے۔ جاوید حسن نے غالب پر تحریر کردہ ڈرامے اور محمد حسن کے عنوان سے اپنے مقالے میں کہا کہ محمد حسن کی انفرادیت یہ ہے کہ انھوں نے مرزا غالب شخص اور شاعر کو مختلف

زاویہ نگاہ اور کئی جہوں کے ساتھ اسٹیج پر پیش کیا ہے۔ نریش ندیم نے غالب کے کلام میں ہینووی کی نوعیت کے عنوان سے مقالہ پڑھتے ہوئے کہا کہ دیوان غالب میں عشق حقیقی کے مختلف پہلوؤں کا بیان ملتا ہے۔ جاوید رحمانی نے غالب تحفید آل احمد سرور کے حوالے سے مقالہ پیش کیا۔ پروفیسر قاضی افتخار حسین نے کلام غالب کی کثرت تفریع کے اسباب کے عنوان سے مقالہ پیش کیا اور کہا کہ شعر کی شرح کے صحیح یا غلط ہونے کا انحصار پہلے تو خود شارح کے مطالع اور ذوق پر ہے۔ کوئی شارح شعری شرح اس وقت تک شروع نہیں کرتا جب تک خود اس کا اپنا تصور شعر نہ ہو۔ دوسری وجہ غالب کا پسندیدہ الجھار ہے۔ مختلف شرحوں کے درمیان اختلاف بھی پایا جاتا ہے۔ کلام غالب کی طرف شاعرین کی کشش کے بہت سے اسباب ہیں اس کے علاوہ بھی غالب کے یہاں کچھ اور بھی ہے جو تجربہ کی گرفت میں نہیں آتا۔ نجمہ رحمانی نے غالب کی زندگی اور حالات زمانہ کے عنوان سے اپنے مقالے میں کہا کہ غالب ان لوگوں میں تھے جنہوں نے وقت کی بغل کو پہچان کر لیا مگر اس کے دھار کو موڑنے کی کوشش نہیں کی بلکہ وقت کے ساتھ بہتے جانے میں عافیت پائی۔ غالب کی زندگی اور شاعری بیک وقت تضادات و احتراجات کا مرقع ہے اور اپنی گل کاریوں کے سبب قارئین کی دلچسپی و وابستگی کا سامان بھی ہے۔ ابو مکرہاد نے شعریت شاعری کا طرہ مہر و غالب کے عنوان سے اپنے مقالے میں کہا کہ غالب جتنے مشکل پسند ہیں اتنے ندرت پسند بھی۔ پروفیسر قاضی جمال حسین نے اپنے مقالے چراغ دیر میں کہا کہ غالب دلی سے نکلتے جاتے ہوئے لاہ آباد پہنچتے ہیں تو ان کی طبیعت تاساڑ ہو جاتی ہے تو لاہ آباد کی جھو لکھتے ہیں بنارس پہنچتے ہیں تو ان کی طبیعت بحال ہو جاتی ہے تو وہ بنارس میں کئی اہتوں کے لیے رک جاتے ہیں اور مثنوی چراغ دیر لکھتے ہیں۔ جو ان کی فنی شاہکار ہے۔ اشعار کی روانی فصاحت کے کمال پر پہنچاتی ہے مثنوی میں غالب کی وسیع المشرقی مذاہب سے رواداری کشادہ دلی نظر آتی ہے وہاں کی معاشرت کو چہ دہا زار کا مرقع کہا جاسکتا ہے۔ وہاب الدین علوی نے کہا کہ غالب کی ہر جہت فکری نظام، غالب پر جنہوں نے لکھا سب پر اور جن کا تعلق غالب اکیڈمی سے تھا ان پر مقالے پڑھے گئے۔

22 مارچ 2017 کو تین سنگھ، منہ کشور و کرم اور وسیم احمد سعید کی خدمات کے اعتراف میں جلسہ غالب اکیڈمی نئی دہلی کی جانب سے مشہور افسانہ نگار جناب رتن سنگھ، مشہور ادیب، صحافی، افسانہ نگار جناب منہ کشور و کرم اور تاریخ کے موضوع میں کتاب لکھنے والے جناب وسیم احمد سعید کی خدمات کے اعتراف میں ایک جلسے کا اہتمام کیا گیا جس میں ان تینوں حضرات کی خدمت میں ایک میٹھو، مثال اور گیارہ گیارہ ہزار روپے کا چیک پیش کیا گیا۔ اس موقع پر غالب اکیڈمی کے صدر پروفیسر شمیم حقانی نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ رتن سنگھ کی کہانیاں اپنے اختصار اور جامعیت کے اعتبار سے ایک منفرد حیثیت رکھتی ہیں۔ انھوں نے مکھنوں کے ادبی ماحول کی رونق میں بہت دنوں تک اضافہ کیا۔ اب وہ ٹونڈا میں مقیم ہیں۔ فکشن کے علاوہ ان کا رجحان تصوف اور مذہبیات کی طرف بھی ہے۔ لکھنے پڑھنے کی سرگرمی عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ تیز تر ہوتی جا رہی ہے۔ منہ کشور و کرم نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز صحافت سے کیا۔ ماہنامہ آج کل کے اسٹنٹ ایڈیٹر رہے۔ سبکدوشی کے بعد اپنا رسالہ عالمی اردو ادب نکال رہے ہیں۔ جس کے خصوصی نمبر بہت مقبول ہوئے۔ ان کی متعدد کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ وسیم احمد سعید اردو کے روایتی طالب علم نہیں رہے۔ گھر کے ماحول سے انھیں تاریخ اور آراء قدیمہ سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ انھوں نے تاریخ پر کئی کتابیں لکھ کر اردو کے سرمائے میں اضافہ کیا ہے۔

اس موقع پر اظہار خیال کرتے ہوئے جناب رتن سنگھ نے کہا کہ جب میں ریلوے میں ملازم تھا تو میری قابلیت بہت کم تھی اور میں افسانے لکھتا تھا اس وقت بڑے افسانہ نگار جیسے عابد سبیل، اقبال مجید، رام لعل، علی عباس حسینی افسانے لکھتے تھے۔ پھر اس کے بعد بھی افسانے کی روایت باقی رہی لیکن اب یہ سلسلہ ٹوٹا ہوا نظر آ رہا ہے۔ منہ کشور و کرم نے اپنی زندگی کے حالات پیش کرتے ہوئے کہا کہ ادبی صحافت اور اردو فکشن کے لیے بچپن سے کوشش کر رہا ہوں، اٹھاسی سال کی عمر میں اب بھی نصف رات تک کام کرتا ہوں عالمی اردو ادب کے لیے مواد کی فراہمی، کمپوزنگ اور ڈیکٹو میں خود کرتا ہوں۔ جلسے کی صدارت ڈاکٹر جی آر کنول نے کی انھوں نے رتن سنگھ اور منہ کشور و کرم کی ستائش کی۔ آخر میں ڈاکٹر سید فاروق نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔



مطبوعات غالب اکیڈمی

قیمت	مستند و محترم	نام کتاب
100/-	غالب اکیڈمی	دیوان غالب (ہندی)
100/-	غالب اکیڈمی	دیوان غالب عام ایڈیشن
450/-	غالب اکیڈمی	یادگار غالب قاری متن کے ترجمے کے ساتھ الطاف حسین حالی
200/-	غالب اکیڈمی	دیوان غالب (انٹیکس)
300/-	قاضی سعید الدین ملک	شرح دیوان غالب اردو
350/-	تکلیل الرحمن	غالب اور ہندو مغل جمالیات
90/-	ضمیم طارق	غالب بہادر شاہ ظفر اور 1857
550/-	ضمیم احمد مہاسی	شرح دیوان غالب (ہندی)
200/-	جمال عبدالواحد	غالب کا غیر متداول کلام
35/-	محمد عزیز حسن	تصویرات غالب
300/-	ایس اے آئی ترنڈی	نامہ ہائے قاری
300/-	پروفیسر عظیم احمد صدیقی	مومن شخصیت اور فن
75/-	پروفیسر محمد حسن	ہندوستانی رنگ
40/-	غالب اکیڈمی	نوائے سرودی (انگریزی)
95/-	پروفیسر اسلوب احمد انصاری	اقبال و مضامین مقالات
75/-	پروفیسر محمد حسن	جنوب مغرب ایشیا میں رابطے کی زبان
90/-	اقبال بھری شمل (قاضی افضل حسین)	رقص شرر
350/-	یوسف حسین خاں	غالب اور آجنگ غالب
90/-	محمود نیازی	تلمیحات غالب
200/-	ڈاکٹر عقیل احمد	جہات غالب
150/-	ڈاکٹر عقیل احمد	تحکیم عبدالحمید شخصیت اور خدمات
150/-	تحکیم عبدالحمید	مطالعات غلطہ غالب
800/-	تحکیم عبدالحمید	مطالعات کلام غالب
150/-	دجاہت علی سندیلوی	نشاط غالب
150/-	پروفیسر محمد علی	اقبال اور عصر حاضر کا خراپ
100/-	عکس بدایونی	مزار غالب (اردو)
100/-	عکس بدایونی	مزار غالب (ہندی)
200/-	یوسف حسین خاں	غالب اور اقبال کی متحرک جمالیات
160/-	عکس بدایونی	غالب اور منظر

JAHAN-E-GHALIB

HALF YEARLY

RNI No. DEL/URDU/2005/17310

Vol. - 12-

ISSUE - 24

June 2017 - November, 2017

ISSN-2349-6225



Printed by : Dr. Aqil Ahmad, Published by : Dr. Aqil Ahmad on behalf of
Ghalib Academy and Printed at Sheriani Art Printers, 1480, Gashiman Street, Balmain Delhi-5
Published from Ghalib Academy, 168/1, Bashi Hazrat Nizamuddin, New Delhi-110013 Editor : Dr. Aqil Ahmad